احوال
حضرت داؤد علیہ السلام

احوال

الشیخ داؤد جھنی والؒ

ایک مسلمان مبلّغ

۹۱۹ھ ـــــ ۹۸۲ھ

تالیف

سیّد محمّد حیدر

Marfat.com

53010

تعارف

"شیخ داؤد جھنّی وال، ایک مسلمان مبلّغ" دراصل ایک انگریزی تھیسس کا اُردو ترجمہ ہے جسے ۱۹۳۱ء میں سیّد محمد حیدر صاحب مرحوم و مغفور نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔ اے کی سند کے حصول کے لیے پیش کیا تھا۔ ایم اے میں پیش کیے جانے والے تھیسس بالعموم بڑی محدود اہمیت کے واقعات کے بیان اور تبصرے پر مشتمل ہوتے ہیں اور بیشتر اس قابل نہیں ہوتے کہ انھیں چھاپا اور شائع کیا جائے یہ اس لیے کہ ان میں سے اکثر ہماری زندگی یا تاریخ سے کچھ زیادہ تعلّق نہیں رکھتے۔ لیکن شیخ داؤدؒ جھنّی وال پر لکھا ہوا یہ مقالہ ایک استثنائی حیثیت رکھتا ہے شیخ داؤدؒ (المتوفّی ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء) نے جس طرح سولھویں صدی میں پنجاب کے متعدّد جاٹ، راجپوت اور بلوچ قبائل مثلاً وِرک، باجوے، چٹھّے، گوارئیے، تارڑ، ساہی، ہوتیانے، مجھیانے، مان، کاہلوں، سندھو اور وٹّو وغیرہ کو مُشرّف بالاسلام کیا، اس کے اثرات آج بھی فعال اور اہم ہیں۔ یہ قبیلے اگر حضرت شیخ علیہ الرحمہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان نہ ہو جاتے تو آج ہمارے اس برِّصغیر کی حکومت اور سیاست کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

وہ اصحاب جو اسلامی ہند کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیّت رکھتے ہیں، جانتے ہونگے کہ برّصغیر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مسلمان سلاطین اور اُن کے عمّال و عمائد نے کوئی نمایاں خدمت انجام نہیں دی۔ بقائے سلطنت، قیامِ امن اور

Marfat.com

تحصیلِ خراج کے تقاضے پُورے کرنے کے بعد وہ اس کی پروا نہ رکھتے تھے کہ رعایا کا دین اور مذہب کیا ہے وہ شے جو برِّصغیر کے عوام کو ہر دور میں اسلام کی طرف کھینچے لاتی رہی، وہ صوفیۂ کرام اور اُن کی رافت و رحمت سے پُر زندگیاں تھیں۔ صوفیہ نہ صرف توحیدِ باری اور مساواتِ انسانی کے زبانی وعظ گو تھے، بلکہ اُن کی زندگیاں ماسوا اللہ کے خوف اور لالچ سے دُور ہونے کے باعث اتنی پُرکشش تھیں کہ انھیں دیکھنے اور ان کی صُحبت میں بیٹھنے کے بعد لوگ اُنھیں کے ہو رہتے تھے۔ تارک الدنیا بیراگیوں، سادھوؤں اور سَنتوں کے برعکس اکابرِ صوفیہ خلقِ خدا کی خدمت کرنے والے، عالمِ باعمل اور حالاتِ زمانہ سے باخبر ہوتے تھے۔ وہ نہ صرف شاہی درباروں سے بے نیاز رہتے بلکہ وقت پر ان کے علےالرغم اعلائے کلمۃ الحق میں بے باک بھی ہوتے۔ شیخ داؤدؒ نے جس طرح ظالم مقامی راجا اور جس بے خوفی سے سلطان سوری اور مخدوم الملک کے اعتراضات کا جواب دیا، وہ اس کی مثال ہیں۔ ان کے حالات ہماری تاریخ کا ایک نہایت اہم حصّہ ہیں جن سے ناواقف رہنا ایسا ہے جیسے کوئی فرد اپنا حافظہ کھو بیٹھے اور اسے یاد نہ رہے کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔

شیخ داؤد جھُنی والؒ نسباً سیّد تھے۔ ان کے اجداد عرب سے نکل کر ایران اور سندھ میں کئی پُشتیں گُزارتے ہوئے آخرکار شیر گڑھ میں، جو ساہیوال کے جوار میں واقع ہے، آبسے تھے۔ شیخ داؤدؒ نے یہیں رُشد و ہدایت کا سلسلہ آغاز کیا۔ اور متعدّد مقامی قبائل کو مسلمان کرنے کے بعد یہیں فوت اور دفن ہوئے۔ اُن کے

Marfat.com

خلیفہ اور داماد شاہ ابوالمعالیؒ (۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء-۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء) سے جن کا مزار لاہور میں مرجع خلائق ہے، اہلِ لاہور نسبتاً زیادہ واقف ہیں۔

صاحب مقالہ، سید محمد حیدر صاحب، شیخ داؤد جھنگی وال کے اخلاف میں سے ہیں، اس لیے ایک نظر سے دیکھا جائے تو اُن کا مقالہ اُن کے ایک اپنے بزرگ کا نام روشن کرنے کی غرض کا مظہر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کے بار کے علاقوں کی جاٹ، راجپوت اور بلوچ برادریاں جن کے افراد کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے شیخ داؤد علیہ الرحمہ کو اپنا رُوحانی باپ جانتی ہیں۔ اسلیے سیّد محمد حیدر صاحب کا مقالہ اُن کے لیے، اور ان کے علاوہ دوسرے اہلِ وطن کیلیے انتہائی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

حُسنِ اتفاق کہ مولوی محمد شفیع مرحوم و مغفور نے بھی ایک مضمون ۱۹۵۲ء کے اورینٹل کالج میگزین میں شیخ داؤدؒ کے متعلق لکھا ہے۔ اس مضمون کی دستاویزی اہمیت کے پیشِ نظر اسے بطورِ ضمیمہ شاملِ کتاب کر دیا گیا ہے۔

شیخ داؤدؒ پر سید محمد حیدر کے انگریزی مقالے کا اردو ترجمہ ان کے فرزندِ ارجمند سید محمد محسن صاحب کے ایما پر میرے عزیز دوست اور رفیقِ کار مرزا محمد منوّر، پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور نے کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ جس معنوی دیانتداری، سلاستِ بیان اور روانی بیان کے ساتھ انھوں نے یہ ترجمہ کیا ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے کہ اُنھوں نے ہمارے وطن اور اسلام کی ایک عظیم شخصیت سے اپنے جدید تعلیمیافتہ لوگوں کو روشناس کرایا ہے۔

(ڈاکٹر) سیّد نذیر احمد

Marfat.com

حرفِ آغاز

حق یہ ہے کہ حضرت شیخ جُھنّی دالؒ پر تحقیقی مقالہ مرتب کرنا میرے لیے ایک کٹھن مرحلہ بن گیا۔ میں نے فارسی کے جن مسوّدات کو اس مقالے کی ترتیب کے ضمن میں لائق اعتماد جانا وہ صوفیہ کرام کے شخصی اور ذاتی جذبات کی رنگ آمیزی سے خالی نہ تھے۔ اس بنیادی دِقّت کے علاوہ ایک دقّت اور بھی تھی اور اس کا کوئی حل نہ سُوجھتا تھا۔ وہ دِقّت یہ تھی کہ ان مسودات میں ربط اور تسلسل کا جوہر موجود نہ تھا۔ بایں ہمہ بڑے خلوص کے ساتھ یہ کوشش کی گئی ہے کہ صوفیا۔ کی تحریروں میں سے وہ تاریخی مواد چھان پھٹک کے بعد حاصل کرلیا جائے جو حضرت شیخ داؤد جُھنّی دالؒ سے تعلق رکھتا ہو۔ ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ صوفیہ کی تحریریں اعجاز و کرامات کے ذکر یا کسی پُر پیچ مسئلے ہی کے بیان سے پُر ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے گویا مقالے کی نوعیّت انتخابی ہے۔ ہاں جہاں جہاں ممکن ہوا اس منتخب مواد کی تصدیق مُستند معاصر تواریخ سے کرلی گئی ہے، اور میں اس معاملے میں بدایونی کا ممنون احسان ہوں۔

تاریخی مواد کے انتخاب اور اس کی تصدیق کا معاملہ میرے لیے کچھ حوصلہ افزا نہ تھا کیونکہ مواد قلیل تھا اور خطرہ لاحق ہوگیا کہ مقالہ تشنہ رہ جائے گا۔ مگر جب کام شروع ہوا تو دورانِ تحقیق کچھ ایسی چیزیں معرضِ دریافت میں آگئیں جو ایک حد تک میری تشفی اور تسکین کا باعث بن گئیں۔ بعض ایسی باتیں بھی معلوم ہوئیں جن سے (عام) لوگ قبل ازیں آگاہ نہ تھے۔ مثال کے طور پر بدایونی اور شیخ داؤدؒ کے باہمی روابط کا معاملہ یا شیخ داؤدؒ کا سلطان سلیم شاہ کے دربار میں حاضر ہونا اور بعض الزامات کا جواب دینا وغیرہ۔

Marfat.com

شیخ داؤدؒ نے خود کسی طرح کی کوئی ذاتی تحریر نہیں چھوڑی۔ ان کی یہ بے اعتنائی اور بے نیازی بھی میرے لیے خاصی پریشان کن ثابت ہوئی۔ اگر ہمارے شیخ بھی دیگر صوفیہ کرام کی روش اختیار فرماتے اور ملفوظات کی صورت میں کچھ نہ کچھ چھوڑ جاتے تو میرے لیے یہ تحقیقی کام نسبتاً زیادہ سہل اور زیادہ دلچسپ ہوتا۔

اِن جُملہ دشواریوں سے نبٹنے میں دو کرم فرماؤں نے میری بڑی حوصلہ افزائی فرمائی اور اعانت سے نوازا۔ ایک قاضی فضل حق صاحب ہیں اور دوسرے سیتا رام کوہلی صاحب۔ میں ان دونوں کا سپاس گزار ہوں۔ سیّد شہباز حسین کربلائی اور سیّد عباس علی کا بھی ممنونِ احسان ہوں جنھوں نے مجھے بیش قیمت مسوّدات مستعار دیے۔

گذشتہ سال بورڈ آف سٹڈیز پنجاب یونیورسٹی سے یہ مقالہ لکھنے کی خصوصی اجازت حاصل کی گئی تھی۔ مجھے اس موضوع کے ساتھ ذاتی دلچسپی بھی تھی جس نے مجھے اس کام کو ہاتھ میں لینے پر اُکسایا۔ مگر میں اس امر پر شدید تاسّف کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے "نجات الرشید" "تذکرۃ الواصلین" "روضۃ العلماء" اور "روضۃ النوادر" ایسی ضروری کتابیں بڑی کوشش کے باوجود نہیں مل سکیں۔ لہٰذا ان سے استفادہ کیے بغیر ہی یہ مقالہ مرتب کرنا پڑا۔ یہ تکلیف دہ احساس کلیجے کا بوجھ بنا رہے گا کہ ان کتابوں کی دستیابی کے بغیر میرا یہ مقالہ تشنۂ تکمیل ہے۔

محمد حیدر

مارچ ۱۹۳۱ء

Marfat.com

س

فہرست مطالب

نمبر شمار		عنوان	صفحہ نمبر
		تعارف	ا
		حرف آغاز	د
۱	پہلا باب	شیخ داؤدؒ کے آبا و اجداد اور ان کا برِصغیر میں ورود	۱
۲	دوسرا باب	توضیحی پس منظر	۱۵
		ا اسلام میں فرقہ بندی کا آغاز	۱۵
		ب اسلام کا پیغام	۱۸
		ج اہل بیت کا احترام	۱۹
		د تبلیغ اسلام کو سرکاری اعانت حاصل نہ تھی یہ کام انفرادی سعی و کاوش کے سپرد تھا	۲۰
		ہ تصوف کا ارتقا	۲۱
۳	تیسرا باب	صوفی مبلغین اور اسلام کا ورودِ ہند	۲۴
		ا صوفیہ کے خانقاہی سلسلے	۲۵
		ب مریدوں سے بیعت لینے کا طریق کار، گدیوں کی تنظیم	۲۵
		ج اشاعت اسلام، صوفیہ کی کامیابی کے اسباب	۲۸
		د مقامی کہاوتیں جو تاریخی حقائق پر دال ہیں۔	۲۹

Marfat.com

نمبر شمار		عنوان	صفحہ نمبر
۴	چوتھا باب	اُچ اور ملتان کے اسلامی تبلیغی مراکز: مسلم سلطنت کا حصار، جنوب مغربی پنجاب اور بالائی سندھ کے شہر۔	۳۱
۵	پانچواں باب	شیخ داؤدؒ کی پیدائش۔ سیت پور سے ست گھرا میں منتقلی ابتدائی زندگی، تعلیم، سلسلۂ قادریہ میں شمولیت	۴۲
۶	چھٹا باب	شیخ داؤدؒ کی قیام گاہ شیر گڑھ، شیر گڑھ کی تاریخ اور ماحول، شیخ داؤدؒ کے اوصاف و کمالات	۵۴
۷	ساتواں باب	تحریک مہدویت۔ اس تحریک میں شیخ داؤدؒ اور شیخ بہلولؒ کا کردار۔ شاہی دربار میں شیخ داؤدؒ کی طلبی	۷۳
۸	آٹھواں باب	شیخ داؤدؒ اور بدایونی	۷۸
	ضمیمہ ۱	روضہ مبارکہ (از مولوی محمد شفیع)	۸۵
	ضمیمہ ۲	تعمیر روضہ۔ مقاماتِ داؤدی سے اقتباس	۱۰۴

Marfat.com

Marfat.com

شبیہ مبارک شیخ داؤدؒ جھنّی وال

این شاہ کہ از عشق بحق بُود ثباتش
"یا عاشقِ مست" آمدہ تاریخِ وفاتش
۹۸۲ھ

*

تاریخ طلب کنند اگر اہلِ جہان — بر گوئی معالی بسرِ شوقِ روان
در نہصد و ہشتاد و دو این شاہِ زمان — شد عندلیکِ ملکِ خیمہ زنان

Marfat.com

پہلا باب

شیخ داؤد کے آبا و اجداد اور اُن کا برِّ صغیر میں ورُود

شیخ داؤد کے اسلاف سامی الاصل تھے جن کا وطن عرب تھا۔ وہ سب کے سب علم و فضل کا مجسّمہ تھے۔ تدریس و تربیت ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ بڑے متورّع، متقّی اور راسخ العقیدہ لوگ تھے۔ اس بیان کی تائید مقامات داؤدی کی اس عبارت سے ہوتی ہے کہ بقول شیخ داؤد قدّس سرہٗ "حصول علم، زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میرے آبا و اجداد کا شیوۂ قدیم ہے۔ اگر خدائے لم یزل نے ان میں سے ایک کو حکمت کے خزینے سے مالا مال کیا تو دوسرے کو تورّع اور زہد اور روحانی فیض سے۔ ان میں سے اکثر عالم ہونے کے علاوہ عارف بھی تھے۔ اگرچہ اسلام سرکاری ملازمت اور تجارت سے منع نہیں کرتا تاہم میرے آبا نے نہ تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا اور نہ سرکاری ملازمت کو۔ وہ سب کے سب متوکّل اور قانع اصحاب تھے، راضی برضائے الٰہی۔ وہ نفس کشی کے عادی تھے۔ ولایت کا یہ تحفہ جس سے مجھے نوازا گیا ہے ایک طرح سے میرے عالی شان اسلاف کے عرفان ہی کا فیضان ہے۔ پھر سلسلۂ قادریہ میں میری شمولیت مجھ پر اللہ تعالےٰ کا خاص احسان ہے۔"

Marfat.com

شیخ تقی الدین احمد سے [illegible] منتقل ہو گئے تھے اور کرمان میں بس گئے تھے [illegible] مقامات داؤدی کے اس بیان سے ہوتی ہے:

میں داستان دو حصہ جو کرمان سے متعلق ہے اختصار سے بیان کروں گا۔ شیخ [illegible] سے [illegible] کو ترک کر کے ایران کے کرمان کی آزاد سرزمین کو پسند [illegible] دادی پانچویں پشت میں تھے۔ انھوں نے اپنی [illegible] تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ کچھ عرصہ تو یہ عام [illegible] وقت ایک دارالعلوم کی رونق اور ایک خانقاہ کی زینت تھے۔ اس [illegible] کہ انھوں نے اپنی زندگی سرتاسر مقاصدِ خیر کے لیے وقف کر رکھی تھی ایسے [illegible] میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ لہٰذا ہمیں یقین ہے کہ انھوں نے اپنی عزلت [illegible] کے اصول ارفع کی بنا پر اپنے معاصرین کی نظر میں عزت کا مقام اعلیٰ حاصل کر لیا ہو گا۔ یہ بات لائق تحسین ہے کہ ایک شخص اپنی زندگی سرتاسر اولادِ آدم کی [illegible] تعلیم اور تربیت کے شغل میں بسر کر دے۔ اپنے والد بزرگوار کی پیروی [illegible] نامدار کی دامانی اس قیاس کو حق بجانب اور صحیح ثابت کرتی ہے۔

شیخ تقی الدین احمد کے بعد ان کی مسندِ مقدس پر ان کے فرزند ارجمند شیخ صفی الدین آدم جلوہ افروز ہوئے۔ عبدالباقی مؤلفِ مقامات داؤدی ان کی نیک نامی پر شاہد ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ جب شیخ تقی الدین احمد کی وفات ہوئی تو ان کے مقدس سجادے پر جو ولایت و کرامات کا مصدر و مقام ہے ان کے پاک طینت خلف الرشید سید العارفین حضرت شیخ صفی الدین آدم رونق افروز ہوئے اور اس طرح یہ مسند مرجعِ عوام اور ملجأ خواص بن گئی۔ وہ علوم متداولہ ہی کے قائل نہ تھے بلکہ تصوف اور علم کلام میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے

Marfat.com

"روضۃ الاثمار" اور "جواہر الاسرار" دونوں انھیں کی تالیفات ہیں۔ ان دونوں کا موضوع تصوف میں ہے۔ دونوں معروف کتابیں ہیں اور کرمان میں انھیں بڑا رواج حاصل ہے۔ شیخ صفی الدین فلسفہ وطب کے بھی ماہر تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز شہزادہ میراں شاہ گھوڑے سے گر پڑا اور اس کے سر اور دماغ میں شدید چوٹیں آئیں۔ معاصر اطبا نے بڑی توجہ اور احتیاط سے علاج کیا مگر درد کا درماں نہ ہو سکا۔ ضعفِ دماغ کا عالم یہ تھا کہ شہزادے کے دیوانہ ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ آخر جب تمام اطبا نے اس کے علاج سے ہاتھ کھینچ لیا تو شیخ صفی الدین نے اس کا علاج شروع کیا جس سے شہزادہ جلد ہی صحت یاب ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد انھیں "ارسطوئے ثانی" کے خطاب سے مخاطب کیا جانے لگا۔ روحانیت میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ وہ ان اسرار کو بھی پا جاتے تھے جو دلوں کی گہرائیوں میں پنہاں ہوتے تھے۔

اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ وہ سیر و سفر کے بڑے دلدادہ تھے، نیز یہ کہ انھیں اولیائے کرام کے مزاروں کی زیارت کا بے پناہ شوق تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب شیخ صفی الدین مشہد کے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرنے گئے تو چند رسوم دین ادا کرنے کے بعد صفیہ ایک ہند کی سیر و سیاحت کا تہیہ کر لیا، یہاں تک کہ وہ کابل اور وہاں کے دریا تک پہنچ گئے۔ لیکن وہاں پہنچ کر سفر کا ارادہ ترک کر دیا اور لوٹ گئے۔ ان کا انتقال ۱۰ شوال ۹۳۰ھ بروز جمعہ بمقام دماوند ہوا۔ یہ گاؤں کرمان کے جوار میں واقع ہے۔ ان کا مقبرہ اسی مقام پر ہے اور مامن و مرجع انام ہے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ستاسی سال سے متجاوز تھی۔

شیخ صفی الدین کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام میر فیض اللہ تھا اور دوسرے کا میر کاظم علی۔ میر کاظم علی اپنے والد کی زندگی ہی میں رحلت کر گئے تھے۔ اس طرح ایک بیٹا باقی رہ گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اسے "باقی" کے لقب سے ملقب کیا۔ میر کاظم علی بھی بے اولاد نہیں فوت

Marfat.com

ہوئے تھے۔ مقامات داؤدی کے مؤلف نے ان کے دو صاحبزادوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک ابوالحسن اور دوسرے محمد رشید۔ یہ دونوں اپنے والد کی وفات کے وقت حیات تھے۔

بہرحال شیخ صفی الدین کے وہ جانشین جو فرائضِ دین کی انجام دہی کے تحویل دار ہوئے میر باقی تھے۔ میر باقی کے یہاں، جب وہ ۴۹ برس کے تھے۔ تو ایک فرزند تولد ہوا جس کا نام انھوں نے سید مبارک رکھا۔ سید صفی الدین کی وفات کے بعد کچھ عرصہ ان کا تمام خاندان کرمان ہی میں سکونت پذیر رہا یہاں تک کہ حوادثِ روزگار نے انھیں اُن اقطاع کی طرف نقلِ مکانی پر مجبور کر دیا جو اُن کے آباؤ اجداد نے نہ دیکھے تھے۔

گویا یہ مقدر تھا کہ یہ خاندان جلد ہی نقلِ مکانی کرے۔ کرمان کی سیاسی فضا خراب ہو گئی تھی۔ کسی کے جان و مال کے تحفظ کی ضمانت نہ تھی۔ چنانچہ تمام خاندان نے برصغیر پاک و ہند کا رُخ کیا۔ اُس دور میں برصغیر مسلمان مہاجرین سے معمور تھا۔ بقول عبدالباقی میراں شاہ جو بہادر، وسیع القلب اور خوبرو شہزادہ تھا شہر کرمان اور اس کے گرد و نواح کا فرمانروا تھا جب اس کی فرمانروائی رُو بہ زوال ہوئی تو اس کے خاندان کو کسی محفوظ تر جگہ کی طرف نقلِ مکانی کرنا پڑی۔

یہی مورخ رقمطراز ہے کہ میراں شاہ سات سال تک خراسان کا بادشاہ رہا اور تین بار عراق اور آذر بیجان پر حملہ آور ہوا۔ جمادی الاولیٰ ۷۹۵ھ میں اس نے عنانِ اقتدار اپنے لڑکے ابوبکر مرزا کو سونپ دی اور خود برائے نام حکمران رہا۔ حق یہ ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو اور پوری سلطنت کو ابوبکر مرزا کے انتظامی اختیار میں دے دیا تھا مگر ان انتظامات کی عمر بہت نہ ہوئی۔ اس لیے کہ ۷۹۸ھ میں ابوبکر مرزا ترکمانوں کے ہاتھوں مارا گیا لڑکے کی موت کے بعد خود میراں شاہ کو بھی ترکمانوں نے شکستِ فاش دی اور اسے

Marfat.com

طوعاً وکرہاً کرمان کی جانب لوٹنا پڑا۔ اس نے ترکمانوں کے خلاف جنگ جاری رکھی اور آخر کار میدانِ کارزار میں کھیت رہا۔ اس کی موت کرمان کی تباہی کا باعث بن گئی۔ ترکمانوں نے کرمان کو تاراج کر ڈالا۔ امیر، غریب، اعلیٰ اور ادنیٰ سبھی ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ اس افراتفری کے دوران میں اور اس تغیرِ احوال کے فوراً بعد میر فیض اللہ باقی اپنے لڑکے سیّد مبارک کو ساتھ لے کر وارد برّصغیر پاک و ہند ہوئے۔ ابوالحسن اور محمد رشید نے جو میر کاظم کے فرزند تھے اپنے چچا کا ساتھ نہ دیا اور ہندوستان نہیں آئے۔ انھوں نے نجفِ اشرف کی طرف کوچ کرنے کو ترجیح دی جو امامِ اوّل اور خلیفۂ چہارم کا مدفن ہے۔ ان دونوں صاحبزادوں کے بارے میں ازاں بعد کوئی خبر نہیں ملتی۔ اس طرح دو ندیاں جن کا منبع ایک تھا ایک دُوسری سے یُوں الگ ہو کر بہ نکلیں کہ پھر ان کا اتّصال کبھی نہ ہو سکا۔

میں اس زمانے میں اس خاندان کی نقلِ مکانی کو معرضِ سوال میں نہیں لانا چاہتا تاہم اگر سیّد فیض اللہ باقی کے ترکِ وطن کے باب میں کسی شک و اشتباہ کی گنجائش ہو تو اس کی عبدالباقی کے حوالے سے تردید کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں یہ ذکر موجُود ہے کہ ایک شہرۂ آفاق عالم و زاہد شیخ بہاؤالدین اصفہانی نے، جو اس خاندان کے ترکِ وطن کے بعد ہندوستان میں آئے تھے اور جن کو پنجاب میں سے گزرنا پڑا تھا، حضرت شاہ ابوالمعالی کا شہرہ سنا تو انھیں میر فیض اللہ باقی کے اخلاف کا ایک فرد تسلیم کر لیا۔ اگر ان کی تحریر کے اس ٹکڑے کا یہاں ترجمہ دے دیا جائے تو بے محل نہ ہوگا: "صاحبِ روضۃ النوّادر، جس کا نام سلطانی ہے، اس واقعے کے آخری حصّے میں بیان کرتا ہے کہ میر فیض اللہ باقی اور سید مبارک کے ہندوستان کی طرف

Marfat.com

منتقل ہو جانے کے بعد ان کے بارے میں مجھ تک کوئی خبر نہ پہنچی تھی۔ لیکن شیخ بہاء الدین اصفہانی نے کہ دینی محقق اور مشہور عالم تھے، دکن، ہند اور پنجاب کی سیر و سیاحت کے بعد مجھ کو بتایا کہ میر فیض اللہ باقی کی اولاد میں سے ایک شخص ابوالمعالی اپنے باپ کی عارفانہ اور دیندارانہ صفات سے متصف ہے۔ اور ہندوستان کے اس نواح میں نام پیدا کر رہا ہے۔" فارسی کی ایک آدھ غیر واضح ترکیب سے قطع نظر اس حوالے کا مفہوم واضح ہے اور اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت شاہ ابوالمعالی سے دو یا تین پشت اوپر ان کے آبا ترکِ وطن کر کے ہندوستان آتے تھے۔ اس بات کا اصل سراغ ہمیں اسی مورخ سے ملتا ہے جس کا نام سلطانی ہے۔ صاحبِ معارفِ داؤدی عبدالباقی نے اس ایرانی مورخ کے بیان کی تصدیق کر دی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ اس بیان کو اپنے الفاظ میں دہرا دیا ہے۔

اس خاندان کے ہندوستان کی جانب نقل مکانی کرنے میں اس کم و بیش تفصیلی بحث کے بعد ہمارے لیے یہ جاننا باقی رہ جاتا ہے کہ یہ خاندان ابتداءً برصغیر پاک و ہند کے کس صوبے میں آباد ہوا۔ اور کس راستے سے اس ملک کے زرخیز میدانوں میں وارد ہوا۔ ان کا شمال مغربی درّوں کی راہ سے اس برصغیر میں آنا خارج از بحث ہے اور ایسے قرائن قطعاً موجود نہیں جن کی بنا پر ہم یہ نظریہ قائم کر لیں کہ وہ ان درّوں میں سے گزر آتے ہوں گے۔ اس اعتبار سے صوبۂ پنجاب کو ان کا ابتدائی مسکن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا یہ بات فرض کر لینا قرینِ قیاس ہے کہ وہ لوگ پہلے پہل براستہ مکران صوبۂ سندھ میں داخل ہوئے، اور اس امر میں کوئی انوکھا پن نہیں، اس لیے کہ ایسے مسلمان تارکینِ وطن وقتاً فوقتاً موج در موج ہندوستان میں آتے

Marfat.com

رہے ہیں جن کا مقصد سرزمین ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت تھا۔ یہ لوگ سندھ سے ہوتے ہوئے براستہ ملتان ہندوستان میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ میں عنقریب اس موضوع کی طرف لوٹوں گا اور تاریخی نظائر پیش کر کے اس حقیقت کو واضح کروں گا۔ ہاں تو سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے میں شیخ داؤدؒ کے ابتدائی مسکن کے متعلق عبدالباقی کا حوالہ دیتا ہوں "کہتے ہیں کہ نویں صدی ہجری کے اوائل میں میر فیض اللہ اور سید مبارک ملتان کے قریب اُچ کے مقام پر پہنچے۔ انھوں نے داؤد جل کے گاؤں کی آب و ہوا کو معتدل اور موافقِ طبع پایا۔ چنانچہ وہاں زمین کا ایک ٹکڑا خرید لیا اور اس پر ایک حسین و جمیل مسجد تعمیر کی۔ ساتھ ہی ایک پُرفضا تسبیح خانہ بھی بنایا۔ آب پاشی کے لیے ایک کنواں بھی کھدوایا اور رہنے کے لیے ایک مکان بھی کھڑا کیا۔ چنانچہ ان کے وجودِ مسعود کی بدولت یہ جگہ جلد ہی ہر کس و ناکس کے لیے ملجا و ماویٰ کی صورت اختیار کر گئی۔"

اس امر کا اطمینان کر لینے کے بعد کہ وہ لوگ ہندوستان میں درّۂ ملّا کی راہ سے آتے تھے یہ سوال بہرحال پیشِ نظر رہتا ہے کہ آیا وہ زندگی بھر وہیں مقیم رہے یا کبھی مراجعت بھی کی تھی۔ مقامات داؤدی[1] کے مصنف کی شہادت زیادہ قابلِ اعتماد معلوم نہیں ہوتی اس لیے کہ یہاں بیان میں تناقض ہے اور سلسلۂ روایات بھی جو نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہا ضعیف ہے۔ اس سے قطع نظر کر کے ویسے بھی دیکھیں تو ان کا واپس جانا قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ اگر انھیں واپس جانا ہوتا تو آتے ہی کیوں؟ اور اگر مستقلاً آباد ہونے کی نیت نہ ہوتی تو زمین کیوں خریدتے اور اس پر مکان

---

[1] مقاماتِ داؤدی صفحہ نمبر ۱۶

Marfat.com

کیوں استوار کرتے، یہ وہ سوال ہیں جو اپنے آپ ہماری تنقید کا ہدف بن جاتے ہیں
میرے نزدیک گمانِ غالب یہ ہے کہ اُن کا مستقل قیام سندھ ہی میں رہا
اور وہ سندھ ہی میں سپردِ خاک ہُوئے۔ شیخ داؤد کے پوتے میر سعید اللہ فیضی کی
وساطت سے ہم تک یہ روایت پہنچی ہے کہ میر فیض اللہ باقی ایران کی طرف سے
دریائے سندھ کے کنارے ہی سے مراجعت کر گئے تھے۔ یہ میر سعید اللہ فیضی علم تاریخ و
منطق میں ماہر تھے اور جملہ اکتسابی اور طبعی کمالات سے مالا مال (انھیں ان کے ادبی
کارناموں کی بدولت "خسروِ ثانی" کہا جاتا ہے) لیکن اِس مصنفِ حقیر (عبدالباقی) نے
اپنے اعزہ میں سے اکثر کی زبانی سنا ہے اور خصوصاً اپنی دادی اماں سے جو اپنے اخلاص
اور تقوے کی بدولت رابعۂ ثانیہ تھیں، اور دادی اماں نے خُندہ بی بی کی چوتھی لڑکی سے
جو شیخ کی بڑی بہن تھیں، سُنا کہ میر فیض اللہ باقی اور سید مبارک کے مقابر اسی ارضِ
مُقدس میں پیلو کے ایک درخت کے نیچے واقع ہیں[1] وہ مزید رقمطراز ہے کہ "وہ
بزرگ جو سندھ کو عبور کر کے واپس ایران گئے وہ صفی الدین آدم تھے۔ اور سلطانی
بھی اپنی کتاب روضۃ النوادر میں اس بات کا ذکر کرتا ہے۔ واللہ علم بالصواب[2]
بہرحال ایران واپس جانے والے میر فیض اللہ باقی نہ تھے، وہ سید صفی الدین آدم
تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میر فیض اللہ کبھی ہندوستان آئے ہی نہ تھے وُہ نواحِ دریائے کابل
ہی سے ایران واپس ہو گئے تھے۔ اب ہم نے گویا اس مخمصے سے نجات پالی ہے
جو سدِ راہ تھا۔ لہٰذا اب ہمارا بیان ایک واضح منزل کی جانب روانہ ہوتا ہے۔
سب سے پہلے یہ خاندان ملتان کے قرب وجوار میں آباد ہوا جس گاؤں میں ان

---

[1] مقامات داؤدی صفحہ نمبر ۱۴۔ [2] مقامات داودی صفحہ نمبر ۱۴

Marfat.com

لوگوں نے ڈیرہ ڈالا اُسے داؤد جل کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مقام بہاول پور کے موجودہ قصبے اُچ کے قریب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ "مقاماتِ داؤدی" کے مصنّف نے شیخ داؤدؒ کی یاد کے حضور ارادتمندی کے ساتھ ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ ورنہ اس نام کے کسی گاؤں کا پایا جانا قرینِ قیاس نہیں۔ لسانی اعتبار سے داؤد جل کے الفاظ کا مطالعہ کرنے پر ہمیں پتا چلتا ہے کہ داؤد کا لفظ خود حضرت شیخ داؤدؒ کی نسبت سے استعمال ہوا ہے۔ اور جل ایک درخت ہے جو بہاول پور کے میدانوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ اور پنجاب کے ان نواح میں بھی اس درخت کا نام یہی ہے۔ پنجاب کے دُوسرے حصّوں میں اسے "وَنّ" کہتے ہیں۔ یہ عموماً پرانے گورستانوں میں اگتا ہے۔ چونکہ ہمیں صحیح طور پر معلوم ہے کہ شیخ داؤدؒ کے خاندان نے وارِدِ ہند ہو کر کس قسم کے ماحول کا آغاز کیا تھا اِس لیے ہم یہ بات بلا چُون وچرا تسلیم کر لیتے ہیں کہ وَنّ کا درخت اس خاندان کے قبرستان پر اُگا ہوگا۔ بمرورِ زمان قبرستان کے باب میں تغافل کا در آنا اور اس خاندان کی آبائی وطن سے نقلِ مکانی وغیرہ ایسے واقعات ہیں جنھوں نے شیخ کے مداحوں کے ذہنوں میں ان کی موہوم سی یاد لازماً چھوڑی ہوگی اور پھر جن لوگوں کو ان کی یاد زیادہ عزیز ہوگی انھوں نے اس جگہ کو کسی نہ کسی طرح شیخ سے منسوب کر دیا ہوگا۔ اور اس طرح اس کا نام داؤد جل رکھ دیا ہوگا۔ اس ضمن میں ہمیں مقامی تاریخ سے مزید کچھ نہیں ملتا۔ خود شیخ کا اپنا ایسا کوئی دعویٰ نہیں کہ ان کا اس گاؤں سے اتنا قریبی تعلق رہا ہو کہ وہ انھیں کے نام سے مشہور ہو گیا ہو۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ وہ اس گاؤں میں پیدا ہوئے اور زندگی کے ابتدائی چند سال بھی وہاں بسر کیے۔

Marfat.com

بہرحال میں شیخ کے آبائی گاؤں کے ضمن میں عبدالباقی کے بیان پر جو محض جولانیِ تخیل کا ثمرہ ہے خطِ تنسیخ کھینچتا ہوں، اور موجودہ سیت پور ضلع مظفر گڑھ کو ان کا آبائی مسکن قرار دیتا ہوں۔ بدایونی اور داراشکوہ بھی ہند کے مشاہیر اولیاء علماء کا ذکر کرتے ہوئے اسی بات کی تصدیق کرتے ہیں دونوں کی رائے ایک ہے اور دونوں کی کتابوں میں مندرج عبارت کا مفہوم کم و بیش ایک ہی ہے۔ چونکہ بدایونی، داراشکوہ کی بہ نسبت زیادہ قابلِ اعتماد اور بیان کا اصل منبع ہے نیز یہ کہ داراشکوہ کا بیان میرے نزدیک بدایونی کے خیالات کی محض نقالی ہے لہٰذا اس کو نظر انداز کرتا ہوں۔ اور بدایونی کے یہاں سے اقتباس پیش کرتا ہوں "جھنی" چونیاں کا ایک قصبہ ہے جو لاہور کا پرگنہ ہے۔ جب شیخ داؤدؒ کے اجداد ترکِ وطن کر کے عرب سے واردِ ہند ہوئے تو ملتان کے قریب ایک گاؤں سیت پور میں پہنچے[1] لہٰذا سرزمینِ ہند میں شیخ داؤدؒ کے خاندان کا اوّلین مسکن سیت پور تھا۔ شیخ کے خاندان کی تین پشتیں یہاں رہیں اور یہیں سپردِ خاک ہوئیں۔ میر فیض اللہ بڑھاپے میں ہندوستان آئے تھے۔ وہ سیت پور ہی میں رہے اور وہیں دفن بھی ہوئے عبدالباقی کے حوالے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیّد مبارک کے تین لڑکے تھے۔ ایک کا نام سیّد فتح اللہ تھا۔ جو صاحبِ معرفت تھے، دوسرے کا نام سیّد محمد ہارون تھا جو مظہرِ آیاتِ الٰہی تھے، اور تیسرے کا نام سیّد اللہ داد تھا جو سالکِ راہِ صدق و ہدایت تھے۔ وہ بھی سیت پور میں رہتے تھے کبھی کبھی ان کی زندگی کی یک رنگی و یکسانی میں وہ سفر راحت و سرور

[1] منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۲۸

Marfat.com

پیدا کر دیتا تھا جو وہ ملتان لاہور کی قدیم شاہراہ پر دریائے راوی کے کنارے کنارے کرتے تھے۔ غایتِ سفر کسی ایسے عالم و فاضل کی تلاش ہوتی تھی جس سے قدیم اور لکیر کے فقیر طرز پر (جیسے کہ درسِ نظامی) اکتسابِ علم میں مدد مل سکتی ہے۔ سید ہارون اور سید اللہ داد کے سوانح حیات سے ہمارا اس کے سوا اور کوئی تعلق نہیں کہ وہ اپنے بڑے بھائی شیخ فتح اللہ کی تعلیم کے باب میں بالواسطہ ممد ہوئے۔ یہ شیخ فتح اللہ ہی شیخ داؤدؒ کے والد تھے۔ اس قسم کے خاندانوں میں ایک دستور یہ چلا آرہا ہے کہ بڑا لڑکا اپنے والد کا طریق اختیار کرتا ہے۔ وہ رُوحانی حیثیت اور اس کے متعلقات کے تقاضے بھی پُورے کرتا ہے اور اپنے بھائیوں کے لیے راہِ عمل کا انتخاب بھی اسی کے ذِمّے ہوتا ہے۔ اس پردیسی خاندان نے بھی اس راہِ عمل سے انحراف نہ کیا۔ سید فتح اللہ کو ایسی استعداد حاصل کرنے کا موقع دیا گیا جو باپ کا جانشین بننے کی خاطر ان کے لیے ضروری تھی۔ بہرحال سید فتح اللہ نے مبادیات کی تعلیم اپنے باپ سے حاصل کی۔ پھر علوم مروّجہ و لسانیات کے اصُول سے بہرہ ور ہوئے۔ پھر مزید تحصیلِ علم کی خاطر لاہور آتے جاتے رہے۔ اس امر کی تصدیق مقامات داؤدی کی اس عبارت سے ہوتی ہے کہ اس دوران میں سید فتح اللہ کو یہ شوق دامن گیر رہا کہ وہ امّ البلاد لاہور کے شہرۂ آفاق علما سے استفادہ کریں چنانچہ اپنے والد مکرّم کی اجازت سے عازم لاہور ہوئے۔ اس سفر کے دوران وہ میر چاکر کی بستی میں بھی آئے[1]۔ شیخ فتح اللہ نے یہاں محمد حافظ کی بیٹی سے شادی کر لی۔ محمد حافظ، معزالدین کے لڑکے تھے اور معزالدین، محمد عمادالدین کے۔ معزالدین ملتان شہر کے مشہور مُفتی

[1] مقامات داؤدی صفحہ نمبر ۲۴، فرشتہ جلد چہارم صفحہ نمبر ۳۹۶، طبقاتِ اکبری صفحہ نمبر ۶۴۵

Marfat.com

تھے سید فتح اللہ کے یہاں اس کی بیوی کے بطن سے دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ بڑے لڑکے کا نام سید رحمت اللہ اور چھوٹے کا نام داؤد محمد حافظ پرگنہ قبولہ کے ایک گاؤں عماد پور میں آباد تھے جو انھیں کے بزرگ عماد الدین کے نام سے منسوب ہے۔ اگرچہ یہ گاؤں جملہ انسانی آسائشوں کو ملحوظِ خاطر رکھ کر تعمیر کیا گیا تھا۔ تاہم اس کی زمین اور محلِ وقوع دریا کے کنارے پر تھا۔ لہٰذا وہ آسانی سے سیلابوں کی زد میں آ سکتا تھا اور یہی ہوا کبھی کہ محمد حافظ کے زمانے میں گاؤں سیلاب کی نذر ہو گیا اب محمد حافظ بے گھر ہو گئے۔ اور قریبے قریبے پھرنے لگے حتیٰ کہ میر چاکر کی بستی میں پہنچے جسے آج کل ست گھرا کہتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں میں سردار کی بڑی دھاک تھی اور اسے اس بستی اور اس کے گرد و نواح میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا بہر حال محمد حافظ اور ان کے بڑے بھائی کے لیے یہ بستی پناہ گاہ ثابت ہوئی۔ اور انھوں نے یہاں اپنے لیے مکان بنائے اور ہر طرح کے تفکرات سے فارغ البال ہو کر زندگی بسر کرنے لگے۔ محمد حافظ کے یہاں ایک بچی تھی اس کی شادی وہ کسی عالم اور پاکیزہ سیرت سید سے کرنا چاہتے تھے تاکہ یہ اُمید ان کے طمانیتِ قلب کا سامان ہو کہ گو ان کا اپنا لڑکا لائق اور عالم نہیں تاہم ان کی لڑکی کی اولاد تو علم و فضل سے سرمایہ دار ہے۔

شیخ داؤد کے والد سید فتح اللہ کا ایک طرح سے معمول تھا کہ وہ اپنے والد سید مبارک کی زندگی میں قریبے قریبے گھومتے رہتے تھے تاکہ کسی متبحر عالم تک رسائی حاصل کر لیں۔ لاہور ایک بڑا علمی مرکز اور علما کا مسکن تھا صوبے بھر سے تحصیلِ علم کے جذبے سے سرشار طلبہ لاہور کی مساجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ (مساجد کو قرونِ وسطیٰ میں وہی مقام حاصل تھا جو آج کالجوں کو حاصل ہے)

Marfat.com

اور وہاں کے درس سے مستفید ہوتے تھے۔ چنانچہ مقامی علما کے درس سے استفادہ کرنے کے بعد سیّد فتح اللہ بھی لاہور پہنچے تاکہ جیّد علما سے ملاقات ہو۔ اور اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔

ست گھرا میں جا کر رند کی بستی تھی۔ محمد حافظ اسی بستی میں اپنے خاندان سمیت آباد ہو گئے تھے یہ بستی لاہور، ملتان کی قدیم شاہراہ پر مشرق کی طرف چند میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہ بستی سڑک اور دریا کے بالکل قریب تھی جب سیّد فتح اللہ لاہور کی طرف جا رہے تھے تو اتفاق یوں ہوا کہ انھیں اپنے راستے سے انحراف کرنا پڑا۔ اور اس طرح وہ ست گھرا کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہ بستی یقیناً خوش حال بستی ہو گی۔ کیونکہ اس میں محمد حافظ کے عزیزوں نے ایک اچھی خاصی مسجد تعمیر کرا رکھی تھی۔ ایک کمرہ مہمانوں کے لیے بھی بنا رکھا تھا۔ سیّد فتح اللہ نے یہیں پڑاؤ کیا۔ محمد حافظ کے اعزّہ نے اپنے مہمان سے اس کے حسب و نسب اور کاروبار کے متعلق پوچھ گچھ کی۔ وہ لوگ سیّد فتح اللہ کے جوابات سے اتنے مطمئن ہوئے کہ انھوں نے ان سے استدعا کی کہ سیت پور کی جانب مراجعت کرتے وقت، جو اُچ کے قریب واقع تھا، اُن کے یہاں ضرور اقامت گزیں ہوں، سیّد فتح اللہ نے وعدہ کیا اور چل دیے۔ محمد حافظ کے اعزّہ اپنے اس مہمان کے حسب و نسب اور علم و فضل سے اتنے متاثر ہوئے کہ گویا انھوں نے محمد حافظ کی لڑکی کے لیے مرحوم کی وصیّت کے عین مطابق موزوں رشتہ تلاش کر لیا ہو۔ سیّد فتح اللہ لاہور میں چند ماہ قیام کر کے واپس گھر کو روانہ ہوئے تو راستے میں چند روز ست گھرا میں بھی ٹھہرے اس موقع پر محمد حافظ کے اعزّہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے لئے

Marfat.com

انکی بیٹی کا رشتہ قبول کرلیں۔ مشرقی اسلوب وطریق کے مطابق اُن کی مرضی اُن کے والد کی مرضی کے تابع تھی۔ اس لیے انھوں نے تا اجازت اس رشتے کی قبولیت کو معرضِ التوا میں ڈال دیا۔ اور جب ان کے والد نے رضامندی کا اظہار کردیا تو سیّد فتح اللہ اپنے بھائیوں کو لے کر شادی کا جشن منانے ست گھرا پہنچ گئے اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شیخ داؤد کی والدہ کے رشتے دار میر چاکر کی پناہ میں بمقام ست گھرا مستقل طور پر آباد ہوگئے تھے۔ حالانکہ وہ اصلاً ملتان کے باشندے تھے اور قبولہ کے پرگنے میں ان کی زمینداری تھی۔

Marfat.com

دُوسرا باب

توضیحی پس منظر

اسلام میں فرقہ بندی کا آغاز

جن مذہبی وجوہ کی بنا پر مسلمانوں نے ملکِ عرب سے خرُوج اور بعض حالات میں ترکِ وطن کیا ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اہلِ اسلام میں جو مذہبی فرقے پیدا ہوئے ان سے تاریخ کا ہر ذہین طالب علم بخوبی آگاہ ہے۔ شیعہ اور سنّی حضرات کے مابین اتنے مذہبی اختلافات پیدا ہُوئے کہ ان کا یہاں احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے ہم اپنی توجہ مسئلہ خلافت تک محدُود رکھیں گے جو اہم ترین متنازع فیہ مسئلہ ہے ملّت نے جانشینی اور خلافت کا فیصلہ حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے حق میں دے دیا اور اِسطرح حضرت علیؓ کے استحقاق کو رد کر دیا جنھیں بعض کے قول کے مطابق رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ مؤخر الذکر کے طرفداروں نے اس انتخاب کی قانونی حیثیت کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور دلیل یہ دی تھی کہ ملّت کے ایک نہایت ہی ذی اثر طبقے کو اس انتخاب میں بروقت اطلاع نہ دی گئی تھی۔

Marfat.com

ان کے مطابق اگر یہ طبقہ حاضر ہوتا تو انتخاب کے نتائج کچھ اور ہوتے کیونکہ اس غیر حاضر طبقے کی اکثریت بنو ہاشم سے تعلق رکھتی تھی۔ اور بنو ہاشم حضرت علیؓ کے رشتے دار بھی تھے اور طرفدار بھی۔

اس مسئلے پر ملتِ اسلامیہ میں ایسے شدید اختلافات پیدا ہوئے کہ حضرت علیؓ کے منصب خلافت سنبھالنے کے بعد ان دونوں میں فرقوں میں جنگ چھڑ گئی، اور یہ سیاسی کش مکش مذہبی چپقلش میں بدل گئی، اور بنو ہاشم (یعنی شیعہ حضرات) بنی اُمیہ سے (جو سنیوں کے نمائندے تھے) دست و گریباں ہو گئے۔ اس کش مکش کی انتہا شہادتِ حسینؓ تھی۔ حضرت حسینؓ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نواسے اور حضرت علیؓ کے فرزند تھے جو کربلا میں اپنے مٹھی بھر رفقا سمیت یزید بن معاویہ کے ایماء پر قتل کر دیے گئے۔ (سنی فرقے کا مذہب سرکاری مذہب قرار پایا اور وہی دینِ اسلام ٹھہرا۔ اس اسلام کا صدر مقام دمشق تھا۔ اور یہ اموی سلطنت کا دارالخلافہ بھی تھا۔ شیعہ حضرات (اہلِ بیتِ رسولؐ) سیاسی و مذہبی اعتبار سے ایک قطعی اقلیت بن گئے۔ اموی حکومت کی منظم کردہ تعذیبی قوتوں نے ان میں سے بعض کو روپوش ہونے پر یا ترک وطن پر مجبور کر دیا۔ بہر حال (شیعوں) معتوب اور مظلوم اقلیتوں نے ایک نیا اصول وضع کر لیا جسے تقیہ کہتے ہیں اور جس کے معنی یہ ہے کہ غالب فرقے کی تعذیبی کارروائیوں سے بچنے کی خاطر اپنے مذہبی جذبات و احساسات کو چھپائے رکھا جائے۔

Marfat.com

امویوں نے دمشق میں تقریباً ایک صدی تک حکومت کی اور اہلِ تشیع و حضرت علیؓ کو برا بھلا کہتے رہے۔ اموی حکومت نے خلیفہ چہارم کی اہانت کی حوصلہ افزائی کی اور دنیائے اسلام کے کونے کونے میں ہر منبر پر سے حضرت علیؓ کو برا بھلا کہتے رہے حضرت عمر بن عبدالعزیز وہ واحد اموی حکمران تھے جنھوں نے حضرت علیؓ کو برا بھلا کہنے کی رسم بند کی، اس رسم کو عرفِ عام میں تبرّا کہا جاتا ہے۔

کچھ مدت بعد اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز دمشق سے بغداد منتقل ہو گیا۔ بغداد تقریباً پانچ سو سال عباسیوں کے زیرِ نگیں اسلامی دنیا کا صدر مقام رہا حتیٰ کہ منگولوں نے ہلاکو خان کی سرکردگی میں بغداد کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ بغداد پر حملہ ابن العلقمی اور خواجہ نصیرالدین طوسی کی ترغیب و ایما پر ہوا۔ ابن العلقمی آخری خلیفہ بنو عباس مستعصم باللہ کا وزیرِ اعظم تھا۔ اپنے خیال کے مطابق ابن العلقمی نے ہلاکو کی مدد سے ایک متعصب حکومت کی تعذیبی کارروائیوں کا انتقام لے لیا جس نے پانچ صدیوں تک شیعوں پر ظلم و ستم روا رکھا تھا۔ اور جو کئی شیعہ ائمہ کو زہر دلوانے کی بھی ذمہ دار تھی اور جس نے بغداد کی تباہی سے فقط چند سال پہلے کوچۂ کرخِ بغداد کے شیعوں سے نہایت بہیمانہ سلوک کیا تھا۔

اہلِ بیتؑ کی پناہ گاہیں

کعبہ حرمین میں تھا، اور وہاں اہلِ بیت کے ستم رسیدہ افراد نے عزلت اختیار کر رکھی تھی۔ ان کی رُوحانی قوتوں پر ایک وفادار اور سرفروش اقلیت کو پُورا پُورا بھروسا تھا، اور وہ اقلیت ان کے ایما پر جان نچھاور کرنے کو تیار رہتی تھی۔ جب مسلمانوں

Marfat.com

کی حکومت جغرافیائی حدود کی وسعت اور سیاسی قوت کے اعتبار سے ترقی کے نصف النہار پر پہنچی ہوئی تھی اس وقت ائمہ کی اولاد جو اہل بیت کے نمائندے اور ان کے طرف داروں کی اولاد تھے تعذیبی قوتوں سے بھاگ کر اور کچھ تبلیغ و اشاعت اسلام کے شوق میں چپ چاپ ایران اور روسی ترکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ دونوں ملک تشیع اور تصوف کے گڑھ ہونے کے ساتھ ساتھ اس ستم رسیدہ فرقے اور اقلیتی طبقے کا ملجا و ماویٰ بھی تھے۔

اگرچہ بغداد میں عباسی دربار کی شان و شوکت اور چمک دمک کے مقابل مکے اور مدینے کی حیثیت و اہمیت سمٹ کر رہ گئی تھی اس کے باوصف ہر مسلمان کے دل میں دین اسلام اور اس کے ان ضوابط و اصول کی جو قرآن کے ذریعے وحی ہوئے تھے اور جن کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درس دیا ہے بڑی ہی عزت اور منزلت تھی۔

اسلام کا پیغام

خدا کی وحدانیت، اور قرآن کے سماوی اور منزل من اللہ ہونے اور رسالت محمدی کو شیعہ اور سنی ہر دو فریق کے یہاں مسلم عقیدے کی حیثیت حاصل رہی۔ رکن حج یعنی بیت اللہ کی سمت سالانہ سفر زیارت مدینہ طیبہ جس کو اصولاً حج کا جزو لاینفک

Marfat.com

بنالیا گیا تھا۔ اسلامی وحدت اور اخوتِ اسلامیہ کی تشکیل کا باعث بن گئی۔ اسلام نے جغرافیائی حدود کی پیدا کردہ حب الوطنی کو کبھی بھی خاص اہمیت نہیں دی مسلمان ایک وسیع المشرب اسلامی شہریت کا مالک تھا۔ مسلمان جو ایک طرف اس دنیائے حرکت و عمل کے پرجوش علمبردار تھے اور دوسری جانب آخرت کے باب میں بھی پُرامید تھے کفّار کی تلواروں پر ٹوٹ پڑے اور وسیع علاقوں کو زیرنگیں کرلیا۔ اسلام کی توسیع اور اس کی ترقی رفتار کو دیکھ کر تمام عالم انگشت بدنداں رہ گیا۔

اہل بیت کا احترام

ابنائے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسلام کی اصل رُوح سے وابستہ رہے، وہ انھیں عقائد و نظریات کی تعلیم و تدریس میں مصروف تھے جن کی تعلیم و تدریس ان کے آباواجداد نے کی تھی۔ کسی بھی بیرونی جارحیت کے دوران میں ایک مرتبہ بھی ان کو اسلام سے بے وفائی کرنے کا الزام نہیں دیا جاسکتا، خواہ ان کے دل میں وقت کی مسلم سلطنت کے خلاف کتنی بھی شکایات جاگزیں کیوں نہ ہوگئی ہوں۔ یہی باعث ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نام لیوا ان کی تکریم دل کی گہرائیوں سے کرتے تھے اسلامی علوم کے باب میں انھیں مسلّم الثبوت اساتذہ کی حیثیت حاصل رہی۔ نیز اسلام کے رُوحانی پہلو کا انھیں صحیح اور حقیقی نمائندہ سمجھا جاتا رہا۔ یہ ان کی پاک بازی، علم و فضل اور اعلیٰ اخلاق اور روحانی اصولوں پر استوار بے لوث زندگیاں تھیں جن کی وجہ سے ایک فرقے (شیعہ) نے ان کی محبت کو خصوصاً اپنے مذہب اور اپنے دین کا اصولِ اساسی قرار دے لیا تھا۔ اہلِ حکومت انھیں سیاسی وجوہ کی بنا پر سزائیں

Marfat.com

بھی دیتے رہے۔ اس کے باوصف انھیں ایک مبارک درخت کا قابلِ قدر ثمر جان کر ہمیشہ انھیں عزت کی نظر سے بھی دیکھتے رہے[1]

مختصر یہ کہ اگرچہ اسلام (دوسری صدی کے بعد) دو فرقوں میں منقسم ہوگیا تھا۔ اس کے باوصف یہ انقسام اس کی کمزوری کا سبب نہیں بنا۔ بلکہ یہ امرِ الٹا اشاعتِ اسلام کا ایک بالواسطہ سبب بن گیا۔ مسلمانوں نے سپین، مصر، ایشائے کوچک اور عراق کو پرجوش مجاہدین اسلام کی تلوار کے طفیل مسخر تو کر لیا۔ لیکن انھوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جس کا ساری سلطنت پر اطلاق ہوتا۔ اور نہ اسلام ہی کو غیر مسلموں پر جبراً ٹھونسا[2] اسلام کی اشاعت کی اصل وجوہ اس کی تعلیم مساوات اور اس کا سادہ مسلک ہے جو ان لمبی چوڑی رسوم سے کہ اخراجات کا تقاضا کرتی ہیں بری تھا۔ نیز مبلغینِ اسلام کا وہ اسلوبِ تبلیغ تھا جو دلوں کو موہ لیتا تھا مطلب یہ کہ دین اسلام کے یہ دو فرقے جو ویسے آپس میں متفق نہ تھے، مفتوحہ علاقوں میں اشاعت و تبلیغِ اسلام کے لیے ہمیشہ متحد و متفق رہے۔

تبلیغ اسلام کو سرکاری اعانت حاصل نہ تھی، یہ کام انفرادی سعی و کاوش کے سپرد تھا

حتمی ثبوت کے بغیر ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب نہیں کہ اسلامی حکومت نے تبلیغِ اسلام کی تحریک کو منظم کیا یا اس کی مالی اعانت کی۔ مسلم ریاست کا انصرام و انتظام

---

[1] سارے ائمہ سادات اور ان کی ساری جمعیت شکار تعذیب عموماً نہیں ہوئی جس بزرگ نے بغاوت کی حکومتی مشینری اسکے خلاف حرکت میں آگئی بعض اوقات خود بغاوت فرو کرنے والی فوج میں بھی سادات کے اخلاف موجود ہوتے تھے عباسی دور کی معاصر تاریخ گواہ ہے [2] از آرنلڈ صفحہ ۲۱۵

Marfat.com

سلطان کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتا تھا۔ لہٰذا اس کے محاصل میں سے جمعیّت مبلغین کے لیے رقوم مخصوص نہیں کی جا سکتی تھیں جن کو مشرقی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایک ایسے مقصد کے لیے تیار کیا جاتا جس کا بے سُود ہونا واضح تھا۔ جب لوگوں کو دبائے رکھنے کے لیے اپنے مخصوص مشرقی انداز میں تلوار موجود تھی تو پھر کیا ضرورت تھی کہ مزید استحکام کی خاطر لوگوں کو اپنے دین کے حلقے میں شامل کیا جاتا، اور اس طرح مفتوحہ آبادی کی دینی ہمدردیاں حاصل کی جاتیں۔ گویا تبلیغ و اشاعت اسلام کا کام ایسے افراد کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا جن کی طبیعت میں اس کام کا میلان موجود ہو۔ اسلامی حکومت نے ایسے مبلغین کی جس قدر پشت پناہی کی اس کا بہترین اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ تبلیغی جذبے سے سرشار لوگ اپنا مذہبی تشخّص اس وقت تک چھپائے رکھتے تھے جب تک وہ ان لوگوں کے دلوں میں جن کو وہ دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کے خواہاں ہوتے تھے اپنا ذاتی اثر و رسُوخ بخوبی نہ پیدا کر لیتے تھے۔

تصوّف کا ارتقا

اہلِ ایران کو غیر ملکی سیاحوں اور مصنّفوں نے ایشیا کے فرانسیسی قرار دیا ہے۔ جس قسم کی دینی شیفتگی اور ریاضت نے ایران اور خراسان کے خطّے میں جنم لیا، وہ خصوصاً ہمارے پیشِ نظر ہے اور ہم اس بات سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے کہ یہ خالص قسم کی اسلام دوستی لطیف اور نسوانی ایرانی تعقّل و تمدّن پر قوی اور متحرک عربی چھاپ کا نتیجہ تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تصوّف کے تصوّر نے ایران اور خراسان میں جنم لیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ ہندوستان ایسے ملکوں میں پھیل گیا۔ ہندوستان میں تصوّف اسلام کے

Marfat.com

آغاز ہی میں آگیا تھا۔ مگر تصوف نے اپنے ارتقا کے جلد ہی بعد کسی بھی خاص اسلامی معاشرے میں محدود رہنے سے انکار کر دیا۔

جنگ قادسیہ نے جس کے باعث ایران مسلمانوں کے زیرِ نگین ہو گیا، مسلمانوں کو محض ایک ملک ہی نہ دیا تھا بلکہ ایک ایسی قوم بھی دی تھی جسے بعد ازاں اسلام کے ایک اقلیتی فرقے کو پناہ دینا تھی اور جسے اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار ہونا تھا۔ جسے اسلامی ادب کو شہرۂ آفاق مورخین، شعرا اور فلاسفہ صوفیہ کی تحریروں سے مالا مال کرنا تھا، اور اس طرح ایک ایسے مذہب کو متشکل کرنا تھا جو اصولِ اخلاق اور نیکوکاری کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ایسے حسنِ عمل اور ایسی ریاضت کی بھی تعلیم دیتا تھی جس کا مقصود مثالی روحانی کمال کا اکتساب ہو اور جو افتراق کے بجائے اتفاق کے نقطوں کو ابھار کر دونوں فرقوں کو ہم آہنگ کر دے۔ یہ صوفیہ ایک ایسے انسان کا تصور ہر دم پیشِ نظر رکھتے تھے جو ذاتِ حق میں مدغم ہوتا دکھائی دے رہا ہو اور اسلام کی حدودِ شرع میں رہتے ہوئے وہ اس مردِ کامل تک پہنچنے کی جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ زہد و تقویٰ کی کوئی پابندی جو وہ اپنے آپ پر عائد کر لیتے ایسی نہ تھی جو انھیں دین سے ضرور دور کرتی۔ یہ اس لیے کہ ان کے اس جذب و کیف کا سرچشمہ تو خود دین ہی تھا۔ شاعری اور خاص طور پر صوفیانہ شاعری نہ صرف ایران و خراسان ہی میں بلکہ برصغیر پاک و ہند میں بھی ذریعۂ اظہار بن گئی، ابوسعید ابوالخیرؒ کا اتباع اس برِ عظیم میں امیر خسروؒ جیسے لوگوں نے کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے صوفیانہ تصورات و خیالات کے بیان کی خاطر جدا جدا اصناف شعری استعمال کیں۔ لیکن ان کا موضوع بہرحال ایک ہی تھا۔[1]

---

[1] MYSTICISM IN ISLAM از نکلسن

53010

Marfat.com

میرے خیال میں تصوّف کے بانی وہ لوگ تھے جو تعصّب کی تیغِ تعذیب سے پناہ کے طالب تھے، اور جن کی تربیت ایسے مکاتیب فکر میں ہوتی تھی جو حضرت علیؓ سے منسوب تھے۔ یہ لوگ حسنِ کردار کو گفتار اور بحث و تمحیص پر ترجیح دیتے تھے صوفیہ کی شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ابنائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی محبّت سے سرشار تھے۔ مثال کے طور پر خواجہ حافظ شیرازی کے کلام میں جو بلاشبہ ایک عظیم صوفی شاعر تھے یہی رُوح موجزن ہے۔

Marfat.com

تیسرا باب

صوفی مبلّغین اور اِسلام کا وُرودِ ہند

یہ تھے حضرات صوفیہ جن کو حق و صداقت کے محرکات سرگرمِ عمل رکھتے تھے دینی حمیت و غیرت جن کا امتیازی نشان تھا ضبطِ نفس اور پابندی اخلاق جن کا خاصّہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ ہندوستان کی سرزمین کے لیے موزوں ترین پیامبر تھے۔ انھوں نے مذہبی تعذیب سے بچنے کے لیے ملک عرب کو خیرباد کہا۔ ان کے ایران سے اور اس کے شمالی افطاع سے نقلِ مکانی کرنے کے اسباب سیاسی تحولات تھے۔ وہ لوگ کبھی ایک معیّن وقت میں وارد ہند نہیں ہوئے اور نہ انھیں ایک ساتھ اپنے وطن سے نکالا ہی گیا تھا وہ عرب میں نہ ٹھہر سکے تو ایران کی طرف نکل گئے اور جب ایران میں سیاسی لحاظ سے محفوظ دارالامان نہ رہا تو وہ ہندوستان میں اتر پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی وہ اپنے دیس کی بات کرتے ہیں تو اس کا تعلق یا ایران کے شہروں سے ہوتا ہے یا رُوسی ترکستان کے شہروں سے، ملکِ عرب سے وطنی تعلق نہیں بتایا جاتا۔ جہاں سے ان کے آبا نے ماضی بعید میں ترکِ وطن

Marfat.com

کیا تھا۔ وسطِ ایشیا میں رُونما ہونے والے نسلی ہنگاموں نے بھی ان لوگوں کو نقلِ مکانی پر ایسا مجبور کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی اور وہ مجبوری تھی منگولوں کے ہاتھوں دنیائے اسلام کی تباہی و بربادی۔ ان منگولوں نے خراسان پر تسلّط حاصل کر لینے کے بعد حسن بن صبّاح کے پیروؤں کو الموت سے نکال باہر کیا اور پھر بغداد کے شاہی صدر مقام اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

صُوفیہ کے خانقاہی سلسلے اور ان کی تنظیمیں

صُوفیہ چار واضح اور بیّن سلسلوں میں منقسم ہیں۔ ان سلسلوں میں سے تین کا رشتہ حضرت علیؓ سے ہے اور اپنے شجرۂ پیری کو حضرت علیؓ تک پہنچا دیتے ہیں ہمیں یہ بات پختہ یقین کے ساتھ تسلیم کر لینی چاہیے کہ یہ صُوفیانہ سلسلے ہندُستانی معاشرے کے طفیلی نہ تھے بلکہ تعلیمی، مذہبی اور رُوحانی تربیت و تدریس کے لحاظ سے یہ نہایت مفید اور کارآمد وجود تھے۔

یہ امر ہمارے ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی فرمانروائی کے بعد بلکہ پہلے بھی کوئی حکومت تعلیم کے لیے کوئی رقم اس طرح مخصوص نہ کرتی تھی جس طرح آج جدید جمہوری ریاستیں کرتی ہیں۔ ہندوستان میں یہ طریقہ تھا کہ تعلیم کے عوض شاگردوں سے خدمت لی جاتی تھی۔

طریقۂ بیعتِ مُریدین اور گدّیوں کی تنظیم

اب ہم پیری کے صُوفیانہ ادارے کی ضروری تفاصیل کا مختصر سا جائزہ پیش

Marfat.com

کرتے ہیں۔ وہ طریقہ جس سے ایک شاگرد کو باضابطہ اپنے پیر کے سلسلے میں شریک کیا جاتا ہے اسے اصطلاح میں بیعت کہتے ہیں۔ جس کا بہتر سے بہتر ترجمہ (HOMAGE) یا عہد وفا یا رُوحانی عہدِ وفا کہتے ہیں۔ یہ تقریب کم و بیش جاگیردارانہ نظام کے حلف وفا سے ملتی جلتی ہے۔ بیعت کی تقریب کے خاتمے پر مُرید اپنے مرشد یا پیر کے سلسلے میں شامل و داخل ہو جاتا تھا۔ پھر مُرشد اسے رُوحانی تعلیم دینے لگ جاتا۔ مُرید یا تو خانقاہ ہی میں رہتا اور مجوزہ رُوحانی تربیت میں مشغول ہو جاتا یا دور تنہائی کی فضا میں جا کر عبادت و استغفار میں مشغول ہو جاتا۔ اس رُوحانی تربیت کے دوران میں اُسے کچھ نہ کچھ رُوحانی طمانیت حاصل ہو جاتی تھی اور باور کر لیا جاتا کہ اس نے سلوک کی منزلیں طے کرنا شروع کر دی ہیں۔ صوفیہ کی اصطلاح میں رُوحانی سفر کے کئی مقامات ہیں اور سالک یا رُوحانی ہادی رفتہ رفتہ اپنے مرید کو اس راہ پر لگا دیتا ہے جسے طریقت کہتے ہیں۔ وہ ایک مقام سے دُوسرے مقام تک اس کی رہبری کرتا ہے تا آنکہ وہ آخری مراحل پا لیتا ہے جن کو فنا فی اللہ اور بقا باللہ کہتے ہیں۔ اول الذکر کا معنیٰ ہے ذاتِ حق میں گم اور محو ہو جانا، مؤخر الذکر کے معنی ہے ذاتِ حق کے ہمراہ ابدی ہو جانا۔

جب پیر یا مرشد دیکھتا کہ اس کے مرید نے دینی قواعد کی خاصی تربیت حاصل کر لی ہے تو اسے ملک کے ایک مخصوص گوشے میں آزادی کے ساتھ رُوحانی تربیت و تدریس کا فرض انجام دینے کی ہدایت کی جاتی۔ اصطلاح کی رُو سے اب گویا مُرید اپنے پیر کا خلیفہ کہلانے لگتا ہے اور اسے شجرۂ خلافت، مقراض اور دُوسری ضروری اشیا دے دی جاتیں تاکہ وہ رشد و ہدایت کا ایک آزاد اور خود مختار مدرسہ

Marfat.com

قائم کرلے[1]۔

مریدوں کو الگ خانقاہیں قائم کرنے کی ہدایت کی بدولت رُوحانی رہنماؤں کے مقابر کے اردگرد کئی گدّیاں وجود میں آجاتیں پھر سالانہ عرس منعقد کرکے رُوحانی اساتذہ کی یاد کو تازہ کیا جاتا جس میں اس سلسلے کے تمام مرید اکٹھے ہوتے، نمازیں پڑھتے اور نمازوں سے فارغ ہوکر مزار پر سلام کرتے، اور سجّادہ نشین کے حضور نذرانے پیش کرتے۔ یہ سجّادہ نشین پیر (مرحوم) پیر کی نمائندگی کرتا تھا۔ خانقاہ یا مزار کی آمدنی میں سے جو تحائف اور جاگیر یا زمین پر مشتمل ہوتی تھی پیری کی روایت کے مطابق لنگر جاری کر دیا جاتا تھا۔ جہاں مرید اور غریب آکر کھانا کھاتے یا جاڑے کی راتیں بسر کرتے۔ پنجاب کی چند گدّیوں کے نام گنوانا بے محل نہ ہوگا۔ مجھے یُوں معلوم ہوتا ہے کہ موجُودہ ملتان ڈویژن کا علاقہ گدیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ڈیرہ غازی خان میں تونسہ شریف سلسلۂ چشتیہ کی گدی ہے۔ اسی طرح منٹگمری (حال ساہی وال) کے ضلع میں پاک پتن کے مقام پر بھی اسی سلسلے کی گدی ہے۔ اوّل الزکر گدّی حضرت سلیمان تونسویؒ سے اور مؤخر الذکر گدّی بابا فرید گنجِ شکر سے منسُوب ہے۔ ملتان میں دو ہی بڑی گدّیاں ہیں ایک شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کی گدّی جس کا تعلق سلسلۂ سہروردیہ سے ہے اور دُوسرے حضرت مُوسیٰ پاک شہید کی گدّی جس کا تعلق سلسلۂ قادریہ سے ہے موجُودہ ریاست بہاول پور کے مقام اُچ میں بھی دو مشہور گدّیاں ہیں ایک سیّد جلال بخاری سے منسوب ہے اور دُوسری سیّد بندگی محمد غوث گیلانی سے[2]

---

[1] خانقاہ کے ضروری لاحقے۔ [2] گزیٹیئر بہاول پور صفحہ ۱۶۴

Marfat.com

اشاعت اسلام ،صُوفیہ کی کامیابی کے اسباب

مندرجۂ بالا تفاصیل کے ذریعے مجملاً یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ کس طرح مبلغ حضرات اپنے سلسلے منظم کرتے تھے، کس طرح ملک کو اپنے تبلیغی مشاغل کی خاطر بانٹ لیتے تھے، اور کس طرح پردیس میں جاکر مستقل ڈیرے اور بسیرے بسا لیتے تھے۔ حالانکہ ان پردیسی علاقوں کے لوگ نسل، مذہب اور معاشرے کی رُو سے ان کے لیے بالکل بیگانہ ہوتے تھے۔ چونکہ وہ پیری کے روپ میں تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھتے تھے اس لیے پیری کے ادارے کے چیدہ چیدہ خط و خال کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں ان کی کامیابیوں کے اسباب کا تعلق ہے ان کے ذاتی اثر و رسوخ کے علاوہ دو نمایاں اور قوی اسباب اور بھی نظر آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ہندوؤں میں ذات پات کے ظالمانہ نظام نے زیریں طبقے کے لوگوں کو آزاد شہریوں کی سی حیثیت دینے سے انکار کر رکھا تھا۔ ان انسانوں کو اپنی تذلیل کا احساسِ شدید ان خوش خلق اور دلجُو مسلمان مبلغین کی خدمت میں حاضر کر دیتا تھا جو اجتماعی مساوات و اخوّت کا درس دیتے تھے۔ دوسرا سبب وہ جذبۂ احترام ہے جو تخیّل آریائی ذہن میں ان لوگوں کے حق میں راسخ تھا جو مافوق الفطرت صلاحیتوں سے سرمایہ دار ہونے کے دعویدار ہوں۔ ہندو ان مبلغینِ اسلام کو پاکیزہ اور مقدّس افراد تسلیم کرتے تھے کیونکہ وہ معجز نما رُوحانی قوتوں کے مالک تھے اور حق یہ ہے کہ وہ مبلغین اسلام، اسلام کی بہترین پیداوار تھے۔

Marfat.com

مقامی کہاوتیں جو تاریخی حقائق پر دال ہیں

ایک تاریخی حقیقت کو بروئے کار لانے کے لیے میں دو مقامی کہاوتوں کا حوالہ دینے کی اجازت چاہوں گا۔ پنجاب کے ضلع منٹگمری میں دو مقامی کہاوتیں ہیں جن کے مفہوم پر شاید غور نہیں کیا گیا۔ وہ ایک عمیق تاریخی معنی پر دال ہیں اور میرے اس تحقیقی مقالے کے لیے اساسی حیثیت رکھتی ہیں جس میں مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ اس برعظیم میں اسلام براستۂ اُچ اور ملتان داخل ہوا تھا۔ ایک کہاوت یہ ہے کہ "لمّن دین داجمّن" اور دوسری ہے۔ "پیری پُر ملتان"۔ پہلی کے معانی ہیں۔ مغرب مذہب اسلام کی جائے پیدائش ہے اور دوسری کا مطلب ہے کہ ملتان پیروں سے بھرا پڑا ہے اور آپ اس پیر کو جلد ہی مبلّغ کے رُوپ میں پہچانیں گے۔ اِن لمن دین داجمن۔ دونوں کہاوتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام برعظیم پاک و ہند کی اس سمت سے آیا۔ تاریخ آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں رُونما ہونے والے محمد بن قاسم کے حملے اور آبادکاری سے پہلے کسی کامیاب اسلامی حملے کے باب میں کوئی شہادت پیش نہیں کرتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کہاوت اس حد تک درست ہے۔ کہ مسلمان پہلے پہل سندھ میں آئے اور وہیں آباد ہُوئے۔ ملتان کا حوالہ دینے میں یہ کہاوت مزید درست نظر آتی ہے کہ یہ شہر عظیم مبلّغین اسلام کا گڑھ تھا۔ سندھ اور ملتان کے علاقوں میں مسلمانوں کی حاوی اور کثیر آبادی کے پیش نظر بھی یہ کہاوت مبنی بر حقیقت نظر آتی ہے۔ مغربی دوآب کے لوآبادیکوں کے آباد ہونے سے قبل ملتان اور منٹگمری کے علاقوں میں کوئی سکھ بمشکل ہی نظر آتا تھا۔ ہندوؤں کے

Marfat.com

بھی گنے چنے گاؤں تھے اور وہ پنجاب کے اس حصے کی بے پناہ مسلم اکثریت کے مقابل ہیچ تھے۔ ملک کے اس حصے میں ہندوؤں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کاشتکاری پر تجارت کو ترجیح دیتے تھے۔ کیا اس کہاوت کی صداقت پر مسلمانوں کی آبادی کے اعداد و شمار شاہد نہیں؟ کیا مسلمانوں کی گدیوں کی فہرست اور ان گدیوں کے محل وقوع سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مسلمانوں نے ملک کے اس حصے میں اشاعت اسلام کا کام بطریق احسن انجام دیا تھا۔

Marfat.com

چوتھا باب

اُچّ اور مُلتان کے اسلامی تبلیغی مراکز
مُسلم سلطنت کا حصا
جنُوب مغربی پنجاب اور بالائی سندھ کے شہر

معلوم یہ ہوتا ہے کہ مسلمان عربوں نے سب سے پہلے ساتویں صدی کے آخر میں برعظیم پاک و ہند کے صُوبے سندھ پر حملہ کیا[1] ہیون سانگ کے وارد ہند ہونے سے بیس برس قبل یہ حملہ عمل میں آیا تھا۔ ہیون سانگ سندھ کی راہ سے ملتان پہنچا تھا۔ اس وقت ابھی راجہ چچھ زندہ تھا اور راجہ ہرش آخری ہند دشہنشاہ کی حیثیت سے ہند پر حکمرانی کر رہا تھا۔ البلاذری اور فرشتہ کی متضاد آرا کے پیش نظر یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ آیا مسلمان پہلے ہی ہلّے میں ملتان تک جا پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے یا نہیں؟ تاہم یہ واضح ہے کہ ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کا حملہ خاصا کامیاب رہا اور مسلمانوں نے مستقل طور پر ایسے علاقے فتح کر لیے جن کے انتظامی اُمور اُچ اور ملتان کے قدیم شہروں میں بیٹھ کر چلائے جاتے تھے[2] سندھ اور ملتان پر عربی تسلط قائم ہو جانے کے باعث مسلمان آباد کاروں اور

---

[1] فرشتہ۔ برگز I-۴ ، [2] ایلیٹ I صفحہ ۱۲۲

Marfat.com

گو عربوں کو سرزمین ہند میں آباد ہو جانے کا موقع مل گیا، مگر ان کو حکم تھا کہ وہ عام آبادی سے الگ تھلگ ان مقامات پر رہیں جو ان کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے۔ خلیفہ کے نمائندے جو اس طرح شہر سے الگ تھلگ اور باہر رہتے تھے صرف جمعے کی نماز کے لیے شہر کی مساجد میں آتے تھے۔ محسوس ہوتا ہے کہ اس غیر ملکی آبادی نے جو شہر کی حدود کے باہر قلعہ بند بستیوں میں رہتی تھی مسلمانوں کی فتوحات کے اولین سیلاب کے بعد یہاں کے باشندوں کو دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کے لیے جبر و اکراہ کا حربہ استعمال نہیں کیا۔ عربوں نے ملک کے انتظامی امور یہیں کے باشندوں کو سونپ دیے تھے کہ عربوں میں اعلیٰ انتظامی صلاحیتیں رکھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، لہٰذا انھوں نے غیر مسلموں سے شریعت کے عائد کردہ ٹیکس وصول کرنے پر قناعت کر لی۔ ملتان مسلمانوں کی بڑی سرحدوں میں سے ایک شمار ہوتا۔ المنصورہ اور ملتان کے قصبے خاصے گنجان آباد تھے۔ ہر قصبے میں ایک بڑا قلعہ تھا جس میں عربوں کا سربراہ رہتا تھا۔ صوبے کو دو الگ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک کے انتظام اور انصرام کا صدر مقام ملتان اور دوسرے کا منصورہ۔[1]

جب خلافت رو بہ زوال ہوئی تو سندھ بغداد کے اثر و رسوخ سے آزاد ہو گیا اور مسلمان اسلام کے ماننے والے کئی فرقوں میں بٹ چکے تھے اور اب ساری ملت ایک خلیفہ کے زیر نگیں نہ تھی۔ قرامطہ بالفاظ دیگر اسماعیلیوں نے جو انتہائی خطرناک علوی تھے دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں وادیِ سندھ پر تسلط جما لیا اور سندھ اور ملتان میں عربوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس صوبے پر حقیقی تسلط قرامطہ ہی کا رہا۔ یہ الگ

[1] RAVERTY J.A.S.B

Marfat.com

بات ہے کہ برائے نام یہ صوبہ غزنویوں کے بھی زیر نگیں رہا[1] محمد غوری نے قرامطہ کو ملتان سے جب کہ وہاں انھیں متعصبانہ حکومت کرتے دو سو سال ہو گئے تھے، مار بھگایا[2]

آئندہ تین سو سال تک ملتان کو مغربی اور وسطی ایشیا سے آنے والے منگول مسلسل پامال کرتے رہے اس طرح ملتان کی تاریخ گویا منگولوں کی یورش کی داستان ہے جس کا آغاز تیرہویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوا تھا[3] اس زمانے میں دہلی اسلامی سلطنت کا مرکز تھا اور ملتان کی عمومی حیثیت یہ تھی کہ وہ رسماً سلطانِ دہلی کا اطاعت گزار رہا، ماسوا دو موقعوں کے۔ ایک موقع وہ تھا جب ناصرالدین قباچہ (۲۷-۱۲۱۰ء) سندھ اور ملتان کا حکمران تھا۔ اس وقت ملتان نے دہلی کی بالادستی سے آزاد ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا[4]۔ اور دوسرا موقع وہ تھا جب لنگاہ قبیلہ (۱۵۲۷-۱۴۴۵ء) شہنشاہ دہلی کی اطاعت سے آزاد ہو گیا تھا۔ منگول خراسان اور وسطی ایشیا سے نکل نکل کر جنوبی پنجاب پر بار بار حملے کرتے رہے، تا آنکہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور پھر بابر کی قیادت میں ۱۵۲۶ء میں ہند پر باضابطہ قابض ہو گئے۔ تیمور خاں کے زیر قیادت بلبن کا بیٹا محمد ۱۲۸۴ء میں شہید ہوا تھا، پھر ۱۳۹۷ء میں تیمور لنگ نے ہند پر چڑھائی کی۔ تیمور کی فوج نے اُچ اور ملتان پر قبضہ کیا۔ پھر تلمبا کو لوٹا اور دریائے بیاس کو عبور کر کے پاکپٹن اور وہاں سے دہلی جا پہنچی۔ ازاں بعد اس صوبے پر ۱۵۲۴ء میں ارغون ترکوں نے حملہ کیا اور ایک طویل محاصرے کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا اور اسے خوب لوٹا، ارغون

---

[1] فرشتہ I صفحہ ۵۲ ، [2] فرشتہ صفحہ ۱۵۷ (حقیقت یہ ہے کہ محمود غزنوی نے قرامطہ کی حکومتِ ملتان کا خاتمہ کر کے ملتان کا غزنی سے الحاق کر لیا تھا) [3] آئین اکبری صفحہ ۳۳۴

[4] فرشتہ (اے. ڈی، ملک) I صفحہ ۲۰۳

Marfat.com

ترکوں نے آخر یہ صوبہ بابر کے حوالے کر دیا۔[1]

تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں صدی کے دوران میں وسطِ ایشیا کے اندر رُونما ہونے والے انقلابات کی وجہ سے جو نسلی افراتفری پیدا ہوئی، اس کی بھی زد بیشتر اسی صُوبے پر پڑی۔ خیبر کے راستے کی دشواریوں اور شمال مغربی نواح میں گکھڑوں کی پائدار مزاحمت کے باعث حملہ آوروں کو دہلی کی طرف پیش قدمی کرنے کی خاطر مجبوراً ملتان کا نسبتاً آسان تر راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا، دہلی ہندوستان کا صدر مقام تھا، اور دہلی کی طرف جانے والی شاہراہ کو جو بھٹنڈے اور ابوہر سے ہو کر جاتی تھی، اس وقت تک مقبول شارع کی حیثیت حاصل رہی۔ جب تک دریائے گگھر اور دریائے ستلج اپنی پرانی رگذاروں کے پابند رہے۔ بعد میں جب ان دریاؤں نے اپنی گزرگاہیں بدل لیں تو اس شاہراہ کو ترک کر دیا گیا۔ اور لوگوں نے ملتان سے دہلی براستۂ لاہور جانا شروع کر دیا۔ مغلوں کے عہد میں اس شاہراہ کو اور بھی زیادہ استعمال میں لایا گیا۔ ابن بطوطہ براستۂ ابوہر اور بھٹنڈا ہی دہلی کی طرف گیا تھا۔[2] کبھی ملتان کی حیثیت یہ تھی کہ یہ شہر نویں اور دسویں صدی میں مشرقی (ہندو) لادینیت کے خلاف مغرب سے آنے والے اسلام کے حصار اور سرحد کا کام دیتا تھا لیکن تیرھویں اور چودھویں صدی میں ملتان کی حیثیت اس بڑے بند کی تھی جو مغرب سے حملہ آور الحاد و بربریت کے خلاف مضبوطی کے ساتھ استوار کر رکھا تھا منگول ہر شے کو اپنی رَو میں بہا لے جانے کے درپے تھے اور حالات متقاضی تھے کہ سلاطین دہلی عظیم قربانیاں پیش کریں اور حملہ آوروں کے عساکر کی یورش

[1] دہلی اور ملتان کے مابین شاہراہ۔ ایم اے سٹو۔ [2] ارسکن صفحہ ۲۹۸

Marfat.com

کو روکیں اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کریں اس پر آشوب زمانے میں ملتان کو سکون میسّر تھا نہ آسودہ حالی۔ اور اگر ملتان اس دور میں کبھی کبھار خوش حال ہوا بھی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قندھار جانے والے تجارتی راستے پر واقع تھا، اس کی خوش حالی کا باعث اس کی قابلِ کاشت اراضی نہ تھی اور نہ اس زمین سے حاصل ہونے والے محاصل۔

تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں صدی میں ملتان اور سندھ کو نہ آرام ہی نصیب ہوا اور نہ آسودہ حالی کا جلوہ ان کی نظر سے گزرا۔ تاہم ایک لحاظ سے یہ علاقے فائدے میں رہے۔ خراسان اور مغربی ایران کی تباہی بڑے بڑے جیّد علما کے ترکِ وطن کرنے کا باعث بن گئی ان علما نے ملتان کی راہ سے دلی کا رُخ کیا۔ لیکن کثیر تعداد ملتان ہی میں رہ پڑی اور وہیں آباد ہو گئی۔ غوریوں کے زمانے میں رونما ہونے والے ہنگاموں نے گردیزی سادات کو ملتان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا[1] کچھ دیر بعد ایک قریشی خاندان ملتان کے قریب آباد ہوا۔ شیخ بہاء الدین زکریا اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ جن کے طفیل یہ خاندان محترم و مکرّم ہو گیا[2] ملتان میں شاہ شمس تبریز کی آمد کے باعث اس شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ وہ شاہ شمس سبزواری تھے، تبریزی نہ تھے۔ پاک پتن میں بابا فرید گنج شکر، اُچ میں سیّد شیر جلال بخاری اور دہلی میں براستۂ ملتان مشہور و معروف ولی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی تشریف فرما ہوئے۔ اجمیر رائے پتھورا کے عہد سے ہندوستان کے عظیم ترین رُوحانی رہنما اور ولی حضرت معین الدین چشتی کا مسکن بنا ہوا تھا۔ ہندوستان میں سلسلۂ قادریہ کے سربراہ حضرت معین الدین

[1] ملتان ڈسٹرکٹ گزیٹیر صفحہ ۲۸ - [2] اخبار الاخیار صفحہ ۲۸-۲۶

Marfat.com

پیشتی ہی تھے۔

یہ اُن چند برگزیدہ اشخاص کے نام ہیں جو ہندوستان میں مبلغ بن کر آتے اور اشاعتِ دین میں مصروف رہے اور یہاں کے دہقانوں کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا۔ مسلمان سوانح نگاروں نے ان کو "مشائخ القدماء" کے نام سے یاد کیا ہے مسلمان مبلغوں کا حال یہ تھا کہ وہ دینی اور دنیوی تعلیم کے حصول کے بعد کسی نیک مرد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے تھے۔ جسے وہ اپنے پیر یا روحانی رہنما کی حیثیت سے قبول کر لیتے تھے۔ وہ تصوف کی راہ میں ان کی رہنمائی کرتا تھا۔ اصطلاح میں اس کو طریقت کہتے ہیں۔ مرید اپنے پیر کی بیعت کرنے کے بعد اپنے پیر کے مسلک میں باضابطہ شامل ہو جاتا تھا، اور جب اپنے پیر کی رہنمائی میں روحانی تعلیم کی تکمیل کر چکتا اور پیر اس میں روحانی اہلیت و استعداد دیکھتا تو اسے اپنا خلیفہ بناتا اور کسی خاص مقام پر جائے مقیم ہو جانے کا حکم دیتا۔ اب وہ خلیفہ الگ اور آزاد ہو کر لوگوں کو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دینے لگتا اور اپنے مسلک میں مریدوں کو شامل کرنا شروع کر دیتا یہ تھا وہ تنظیمی طریق کار جو صوفیہ و مبلغین نے ہندوستان میں اختیار کیا اور لائق داد کامیابیاں حاصل کیں۔ سفر بھی ان کی تعلیم و تربیت کا ایک حصہ تھا ان پاک طینت انسانوں نے دین و ارادت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مکے اور مدینے کی طرف کئی کئی بار سفر کیے تاکہ حرمین کی زیارت سے مشرف ہو سکیں۔ جنوب مغربی پنجاب، سندھ اور ہندوستان کے اس حصے میں ہندوؤں کی باقی ماندہ آبادی میں ان لوگوں نے اشاعتِ اسلام کی غرض سے بڑی سنجیدگی اور خاطر جمعی سے کام کا آغاز کیا اور اتنے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا کہ کسی فاتح کی تلوار نہ کر سکتی

Marfat.com

تھی۔ان بے دین اور مذبذب لوگوں کے دلوں کو خوش خلق اہل علم مبلغوں کے طریق استدلال نے موہ لیا ہوگا اور انھیں ایک نئے ولولے اور امنگ سے سرمایہ دار کر دیا ہوگا۔ پھر اس آبادی کو منگولوں کی یورشوں نے اکسایا ہوگا کہ وہ خود بھی تبلیغ کے کارِ خیر میں مصروف ہوں۔ اس امر کو پیشِ نظر رکھے بغیر جنوب مغربی پنجاب میں مسلمانوں کی حاوی اکثریت کا معاملہ سمجھ میں نہیں آسکتا۔ بہر حال اُچ اور ملتان اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے دو عظیم مرکز بنے رہے اور ملتان کو تو اللہ نے اتنی کثیر مقدار میں مقدس خانقاہوں سے نوازا کہ پوری دنیائے اسلام میں وہ لاثانی شہرت و نیک نامی کا مالک بن گیا۔ عالم یہ تھا کہ اُچ اور ملتان کے اولیا اور علما سے سلاطین کی راہ و رسم رہتی تھی۔ وہ خود خانقاہوں کی زیارت کو آتے تھے اور مزار کی ضروریات کے لیے اور مزار کے متعلقین کی کفالت کے لیے جاگیریں وقف کر دیتے تھے۔

مغلوں کی مضبوط مرکزی حکومت کے زیر سایہ ملتان کو تقریباً تین سو سال آرام بھی میسر رہا اور آسودہ حالی بھی۔ ایرانی اور ہندوستانی سلطنتوں کے وسط میں یہ شہر ایک اہم تجارتی منڈی بھی تھا۔ ملتان اس صوبے کا صدر مقام تھا جو جنوب مغربی پنجاب پر مشتمل تھا۔ بعض اوقات اس صُوبے میں پورا سندھ بھی شامل ہوتا تھا۔ یہ ایک اہم فوجی مرکز تھا جس میں بہت بڑی فوج رہتی تھی۔ حتیٰ کہ قندھار کی فوج بھی اس میں شامل ہوتی تھی۔ اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ قندھار کو ایران کے صفوی حاکموں کی جانب سے آئے دن کھٹکا لاحق رہتا ہی تھا۔ یہی سبب ہے کہ ملتان شاہی خاندان کے کسی نہ کسی شہزادے ہی کی تحویل میں رہتا تھا۔ ملتان اور اُچ علما و

Marfat.com

مبلّغین اسلام کے اس وقت سے مسکن چلے آرہے تھے جب سے اسلام ہندوستان میں پہلے پہل داخل ہوا۔ ابوہرا در بھٹنڈے سے ہوکر دہلی جانے والی سڑک پانی کی نایابی کے باعث چھوڑ دی گئی تھی۔ اس کے بجائے لوگوں نے لاہور کے راستے سے دلّی آنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ مغلوں کے زمانے میں شاہی فوج نے بھی قدیم شاہراہ کو چھوڑ دیا۔ اور لاہور، ملتان کی عام مستعمل شاہراہ پر آمد و رفت زیادہ کر دی لاہور دہلی والی شاہراہ پر سہولتیں نسبتاً زیادہ تھیں کیونکہ یہ دریائے راوی کے تقریباً متوازی چلی جاتی تھی اور کہیں بھی دریا سے زیادہ دور نہ تھی۔

ان مسلم علما میں سے ہر اک نے کتنے لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ البتہ اس بات کا تعین نسبتاً آسان ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے کس کس قبیلے کے اجداد کو مسلمان کیا۔ مسلمان مرشد یا مبلّغ اگر کسی قبیلے کے آباو اجداد کو دائرۂ اسلام میں داخل کرتے تو اس قبیلے کے لوگ اس امر کی تصدیق نہ صرف روپے پیسے کی پیش کش اور نذرانوں اور تحفوں کی شکل میں پیر کی اولاد کے حضور اظہارِ عقیدت کرتے، بلکہ زبانی بھی اس امر کا اعتراف کرتے رہتے تھے۔ جنوب مغربی پنجاب اور سندھ میں پیروں کا جس قدر احترام کیا جاتا ہے اس کی توجیہ کسی اور طرح ممکن نہیں۔

سیّد شیر شاہ جلال الدین بخاری سُرخ پوش پنجاب کے ایک سربرآوردہ مبلّغ تھے، ان کا شمار اوّلین مبلّغوں میں ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے چدّھڑ، سیال، ڈاہر، اور ورن قبائل نے اسلام قبول کیا۔[1] شیر شاہ جلال الدین کی تبلیغی کوششوں کو

[1] بہاول پور گزیٹیئر

Marfat.com

ان کے شہرۂ آفاق پوتے اور خلیفہ مخدوم جہانیاں نے جاری رکھا۔ جن قبائل نے ان کی کاوشوں کے نتیجے میں اسلام قبول کیا ان میں کھرل، لار، اولکھہ، مٹلاس، ڈاہس، ڈھنڈلاس، سنراہ اور کھر قبائل شامل ہیں۔ بھوپا جو کھرل قبیلے کا بزرگ تھا اپنی اولاد سمیت اسلام میں داخل ہوا۔ اس بخاری خاندان کے ایک اور چشم و چراغ سیّد صدرالدین محمد راجن قتال تھے۔ جو بخاری سادات کی روایت کے مطابق تین لاکھ چالیس ہزار تین سو نفوس کے رُوحانی پیشوا تھے۔[1]

جہاں تک بابا فرید گنج شکر اور شیخ بہاءالدین زکریّا کی مصروفیات کا تعلق ہے اس ضمن میں یہ ذکر کرنا مناسب رہے گا کہ موخرالذکر نے سندھ کی آبادی کے بیشتر حصّے کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔ پنجاب میں بھی ان کے مُرید موجُود ہیں۔ مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں۔

بابا فرید گنج شکر اپنے ملتانی معاصر اور دوست کی طرح ہندوستان بھر میں مشہور تھے وہ سلسلۂ قادریہ کے رُکن تھے اور وہ سلسلہ ہندوستان کا سب سے بڑا سلسلہ ہے۔ ہندوستان میں ان کے مریدوں میں سے بہت سے خُلفا ہو گزرے ہیں جنھوں نے یہاں کے باشندوں کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا۔ سیال قبیلے کی شاخ دھرانہ اور فتیانہ کو بابا فرید گنج شکر ہی نے حلقہ بگوش اسلام کیا۔[2] دریائے راوی اور ستلج کی گزرگاہوں کے مابین واقع ضلع ملتان اور منٹگمری کے علاقوں کے بھی بیشتر قبائل کو بابا فرید ہی نے مسلمان کیا تھا۔ ضلع منٹگمری کے گزیٹئر کے مطابق یہاں کے نومسلموں کے اخلاف اپنی اصل اور اپنے قبول اسلام کی یہی روداد بیان کرتے

[1] بہاول پور گزیٹیئر، [2] منٹگمری ڈسٹرکٹ گزیٹیئر صفحہ ۶۴

Marfat.com

ہیں۔ ہر ایک قبیلے کا سردار قاعدے کی رُو سے کوئی راجپوت راجہ ہوتا تھا جس کا تعلق یا سورج بنسی خاندان سے ہوتا تھا یا چندر بنسی خاندان سے اور جس کا وطن یا ہستنا پور تھا یا دہارنگر۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس سردار نے سلطان دہلی کی وہ تجاویز مسترد کر دیں جو دونوں قبیلوں کے درمیان ازدواجی رشتہ استوار کرا دیتیں چنانچہ اسے بھاگ کر سرسریا بٹینر (BATNER) یا اس کے نواحی علاقے میں پناہ لینی پڑی اور پھر وہ دریائے راوی کے قریب پہنچا اور وہاں اس نے حضرت بہاء الدین زکریا یا بابا فریدالدین گنج شکر کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور بیعت بھی کر لی۔[1]

بابا فریدالدین گنج شکر نے دریائے ستلج کے دونوں کناروں پر آباد منٹگمری اور فیروزپور کے اضلاع میں مقیم دلو قبائل کے بہت بڑے حصے کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔ صرف یہی قبائل مسلمان نہ ہوئے بلکہ ان کے علاوہ اور بھی کئی قبائل آباد تھے جنھوں نے ان اوّلین مبلّغین میں سے کسی نہ کسی کے ہاتھ پر بیعت کی اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔

یہ اندازہ لگانا بھی مشکل ہے کہ یہاں کی مقامی کمین آبادی کے کتنے افراد نے کس مُبلّغ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ یہ اس لیے کہ اس واقعے کو گزرے کئی صدیاں بیت چکی ہیں اور دوسرے یہ کہ اس ضمن میں کوئی چیز ضبطِ تحریر میں نہیں لائی گئی ہے درحقیقت اُچ اور ملتان کے رہنما مبلّغوں کے کارنامے جنوب مغربی پنجاب اور سندھ کے علاقوں میں اتنے عظیم الاثر ہیں کہ بعد میں آنے والے مبلّغین نے اس علاقے

[1] گزیٹئر ضلع منٹگمری صفحہ ۶۲، ۶۱

Marfat.com

میں تبلیغی کام کرنے کی چنداں ضرورت محسوس نہ کی۔ اس لیے قدرتاً انہیں پنجاب کے دوسرے علاقوں کی طرف پیش قدمی کرنی پڑی حضرت شیخ ابو داؤد (جھنّی وال) کا شمار انھیں متاخر مبلّغین میں ہوتا ہے۔ ان کے سوانح نگار بعض اوقات انھیں مشائخ المتاخرین کے زمرے کا ایک رکن قرار دیتے ہیں۔ ان کا کام ان کی زندگی کے آخری حصّے میں ذرا سہل ہو گیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت مغلیہ اکبر کے زمانے میں مستحکم ہو گئی تھی اور ہندوستان میں امن و امان کی فضا قائم ہو گئی تھی چنانچہ مسلمان مہم پسندوں، سیّاحوں اور مسافروں کے لیے برّعظیم کے گوشے گوشے میں پہنچ جانا آسان ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اسلام کو اس ملک میں آئے اس وقت تک چھے سات سو سال ہو گئے تھے لہٰذا یہاں کی دیسی آبادی کے لیے اسلام کوئی بے گانہ مذہب نہیں رہ گیا تھا۔

Marfat.com

چوتھا باب

شیخ داؤدؒ کی پیدائش۔ سیت پور سے ست گھرا میں منتقلی۔ ابتدائی زندگی۔ تعلیم۔ سلسلۂ قادریہ میں شمولیت

شیخ داؤد جھنی وال (کرمانی) ۲۷ رمضان المبارک ۹۱۹ھ میں سیت پور کے گاؤں میں پیدا ہوئے آج کل یہ گاؤں ضلع مظفر گڑھ کی حدود میں ہے۔ بدایونی اور عبدالباقی کی جو صاحب مقامات داؤدی ہیں۔ اس باب میں متفق ہیں کہ شیخ داؤد کے والدان کی ولادت سے قبل وفات پا گئے تھے۔ بدایونی کا بیان ہے کہ شیخ داؤدؒ اپنے والد کی وفات کے بعد عالمِ رنگ و بو میں تشریف لائے نیز یہ کہ ان کی پیدائش کے جلد ہی بعد ان کی والدۂ محترمہ کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ بدایونی کا بیان زیادہ معتبر ہے۔ اس کی روشنی میں ہم پر واضح ہو جاتا ہے کہ اس خاندان نے اُچ اور ملتان کے نواح سے ست گھرا کی جانب جو ضلع ساہیوال کی حدود میں ہے کیوں نقلِ مکانی کی۔ اس کے دو اسباب تھے عبدالباقی کے بقول پہلی وجہ یہ تھی کہ اُچ کے نواح میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی تھی اور خود شیخ داؤد بھی اس میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مگر خدا نے انھیں بچا لیا[1] دوسری وجہ

---

[1] مقامات داؤدی از عبدالباقی صفحہ نمبر ۳۱

Marfat.com

حسین ارغوں کے پے در پے حملے تھے جن سے ملتان اور اُچ کے نواحی علاقے بود و باش کے لیے محفوظ نہ رہے تھے[1] ملتان میں لنگاہوں کی حکومت تہ و بالا ہو چکی تھی۔ گویا وہاں بھی کوئی محفوظ ٹھکانہ باقی نہ رہ گیا تھا۔ ناچار ان تیم بھائیوں نے کسی محفوظ تر جگہ پر ڈیرہ ڈالنے کا عزم کیا ہوگا۔ بدایونی کے بیان کے مطابق ان کی والدہ بھی رحلت فرما چکی تھیں[2]۔ چنانچہ ان کے لیے آخری چارۂ کار یہی تھا کہ وہ اپنے نانہالی رشتے داروں کے یہاں پناہ لیں جو ست گھرا میں مقیم تھے[3]۔

مختصر یہ کہ اپنے چچاؤں کو سبت پور میں چھوڑ کر سید داؤد اور سید رحمت اللہ دونوں بھائی اپنا اثاثہ ایک بیل پر لاد کر والدہ کے اعزہ کی جانب چل دیے۔ ازاں بعد چچاؤں کا ذکر نظر سے نہیں گزرتا۔ شیخ داؤد کے تیسرے بھائی سید جلال الدین کا البتہ ذکر آتا ہے۔ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ لیکن اسباب سے لدے ہوئے بیل کے اِدھر اُدھر ہو جانے کے بعد وہ کہاں چلے گئے۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا اس طرح ان کے تیسرے بھائی اور چچاؤں کی کوئی روداد ضبط تحریر میں نہیں لائی گئی اور نہ ان کے متعلق کسی کو کوئی علم ہی ہے۔ ان کی بہنیں ان کے ساتھ ست گھرا گئیں۔ عبدالباقی کے الفاظ میں۔ "یہ مسافر تھکے ہارے متفکر اور خوف زدہ تھے۔ انھوں نے میر چاکر بلوچ کی بستی ست گھرا کو حضرت ابوسفیانؒ کا گھر جانا اور باحال خراب اور بعد تلاشِ بسیار محمد حاجی کے مکان پر پہنچے جو ان کا رشتے دار تھا محمد حاجی کے گھر کو انھوں نے

---

[1] ان حملوں کے ضمن میں واضح ہو فرشتہ جلد IV ص ۳۹، ارسکن صفحہ ۴۵ اور طبقات اکبری صفحہ ۴۶، ۴۷

[2] بدایونی جلد تین ص ۲۸

[3] مقامات داؤدی۔ ص ۳۶۔

Marfat.com

امن وسلامتی کا قلعہ کوہ جانا۔[1] محمد حاجی نے بھانجوں کو خوش آمدید کہا۔ اُنھیں رہنے کو مستقل گھر دیا۔ اور اپنی دونوں بیٹیوں کی منگنی بھی ان سے کر دی۔ چند دن یہاں ٹھہر چکنے کے بعد دونوں بھائیوں نے مساجد میں جانا شروع کر دیا۔ جہاں مقامی علما نے تعلیم و تدریس کے لیے سکول کھول رکھے تھے۔ دیپالپور میں علما نے تعلیم کا ایک مشہور مرکز قائم کر رکھا تھا۔ وہاں بڑے بڑے علما فضلا بلا معاوضہ تعلیم دیتے تھے اس لیے شیخ داؤد اور سید رحمت اللہ نے فیصلہ کر لیا کہ ابتدائی تعلیم دیپالپور ہی میں حاصل کی جائے۔ مقامات داؤدی میں کئی علما کے نام گنوائے گئے ہیں۔ جن سے شیخ داؤد نے تعلیم حاصل کی۔ لیکن بدقسمتی سے شیخ داود کے اُن اساتذہ کے اسما کی جن کا ذکر صاحب مقامات داؤدی نے کیا ہے، اس وقت تصدیق یاب نہیں ہوتی کیونکہ بدایونی کا یہ قول اس کے خلاف جاتا ہے کہ شیخ داؤدؒ نے ابتدائی تعلیم اُچ کے مولوی اسمٰعیل سے حاصل کی جو مشہور عالم شاعر اور صوفی حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی کے شاگرد تھے۔[2] اس امر کا صحیح پتا نہیں چل سکا کہ مولوی اسمٰعیل کہاں رہتے تھے۔ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لاہور میں رہتے تھے، کیونکہ شیخ نے دیپالپور اور نصیر پور (ضلع ساہیوال) میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد لاہور کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ بہرحال مقامات داؤدی کے مصنف اور بدایونی کی آرا اس ضمن میں مختلف ہیں، بدایونی یہ بات دعوے سے کہتا ہے کہ شیخ داؤد نے ابتدائی تعلیم مولوی محمد اسمٰعیل سے حاصل کی ان دونوں باتوں میں تطابق فقط اس طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم یہ باور کر لیں کہ محمد اسمٰعیل اُچ کے رہنے والے تھے اور یہ کہ شیخ کو ابتدائی تعلیم (اس سے قبل کہ وہ

---

[1] مقامات داؤدی صفحہ ۳۷ ، [2] بدایونی صفحہ ۲۹

Marfat.com

ست گھرا کے لیے کوچ کریں) اُچ ہی میں دی گئی اور اس کے بعد وہ تحصیل علم کے لیے دیپالپور گئے اور ازاں بعد لاہور کا رُخ کیا جو اپنی سیاسی حیثیت کے پیش نظر یقیناً ایک بہت بڑا علمی شہر بھی ہو گا۔ اس وقت کے رواج کے مطابق شیخ داؤد نے اپنے بڑے بھائی کے سایۂ عاطفت میں عام دنیوی تعلیم بھی حاصل کی ہو گی اور رُوحانی بھی۔ شیخ داؤد کے فہم و فراست کے متعلق ان کے معلّم کی جو رائے تھی اُسے بدایونی کے حوالے سے نقل کر دینا بے محل نہ ہو گا: "وہ بچپن کے زمانے میں شرح اصفہانی اس آسانی سے پڑھ لیتے تھے کہ ایران کے فطین ترین طلبہ بھی ان کی صفائی فہم اور تیزی ذہن کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان کے معلّم کا یہ قول تھا کہ جس طرح ہم ہرات میں مولانا جامی کی موجُودگی کو نیک فال جانتے تھے عین اسی طرح ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ نوجوان علمی رفعتوں کو چھُو لے گا۔ لوگ اس کے دیدار کو نیک فال جانیں گے اور اس کے اعلیٰ اقوال اور تعلیمات سے مستفید ہوں گے۔"

مقامات داؤدی کے حوالے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے دیپالپور کو چھے ماہ کے اندر اندر چھوڑ دیا تھا۔ نیز یہ کہ بصیر پور کے لوگ ان بھائیوں کے حسن اخلاق اور دیگر خوبیوں سے اتنے متأثّر ہُوئے کہ انھوں نے ان سے اپنے قصبے میں قیام کرنے کی استدعا کی۔ بصیر پور میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ مزید تعلیم کے حصول کی خاطر لاہور کی جانب چل دیے۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس وقت بڑے بھائی نے اپنے آپ کو خاندان کی نگہداشت اور بہبود کے لیے وقف کر دیا تھا درآنحالیکہ چھوٹے بھائی نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھا۔

شیخ کا بصیر پور میں قیام ان کی زندگی میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتا

Marfat.com

ہے کیونکہ انھوں نے "پیری" کا طریق اختیار کرنے کا فیصلہ اسی مقام پر کیا تھا۔ اور اس طرزِ حیات کو ایک عالم ممتاز اور جاہ طلب دنیادار کے اسلوب زندگی پر ترجیح دی تھی۔ اس روش پر گامزن ہونے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی تعلیم کی تکمیل کرتے مقامات داؤدی کے مصنف کی رائے کے مطابق اُن کا ذہن آہستہ آہستہ زہد و تزکیۂ نفس کی جانب مائل ہوتا چلا گیا۔ اور زندگی کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بدلتا چلا گیا۔ علاوہ ازیں یہ کہ اپنی اس زندگی کے انداز سے ان کا دل غیر مطمئن ہوتا چلا گیا[1] اسی مآخذ سے ہمیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہ ذہنی تبدیلی اور اس کا ارتقا نمایاں تھا اس لیے کہ وہ قرآن کا مطالعہ بہت زیادہ کرنے لگے تھے۔ اور قرآن کے صحیفۂ مقدس کی رُو سے مقرر شدہ عبادات سے بھی زیادہ عبادات کے عادی ہو جانے کی مشق میں مصروف رہنے لگے تھے۔ یہ تھی ان کی مزاجی کیفیت، اس وقت جس وقت انھوں نے اپنے کنبے کے ساتھ جو دو بھائیوں پر مشتمل تھا، لاہور کا رخ کیا۔ لاہور میں شیخ داؤد نے میر باقر کے ہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ میر محمد باقر بھی دُوسرے اہلِ ایران کی طرح علم و فضل کے ہر شعبے میں صاحبِ کمال تھے۔ انھوں نے کشاف کے (جو قرآن کریم کی تفسیر ہے) مطالعے کے لیے مُلّا صغیر محمد کا انتخاب کیا۔

مختصر یہ کہ شیخ کو لاہور میں حسب دلخواہ علما میسّر آگئے جن سے انھوں نے علوم مروّجہ بھی سیکھے اور زبانیں بھی۔ یہ عُلما اپنے اپنے شعبۂ علم میں خصوصی اہلیت کے باعث وسیع شہرت کے مالک تھے[2] ان کے بڑے بھائی نے ایک سکول قائم کر کے الگ ذریعۂ معاش کا بندوبست کر لیا۔ وہ امداد جو انھیں ست گھرا

---

[1] مقامات داؤدی ص ۳۹، ۴۰۔ [2] مقامات داؤدی ص ۴۱

Marfat.com

کی جانب سے پہنچتی تھی وہ اس کے علاوہ تھی۔

مرزا کامران (پسرِ بابر) کے زمانے میں شیخ داؤد لاہور میں مقیم تھے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لاہور میں ۱۵۲۰ء کے بعد یعنی اس وقت تھے جب بابر وفات پا چکا تھا۔ اور یہ صوبہ کامران کے زیرِ تصرف آ چکا تھا۔ اس طرح شیخ داؤد کا لاہور میں وارد ہونا اور یہاں مقیم ہونا سولھویں صدی عیسوی کی ابتدائی تین دہائیوں کا واقعہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ ۴۰-۱۵۴۱ء میں ہندوستان مع لاہور اور ملتان مغلوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ مقامات داؤدی میں شیخ داؤد کی زندگی کی وہ روداد جس کا تعلق ان کے قیام لاہور سے ہے بے جوڑ اور پر پیچ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یہاں تصوف کے نقاط زیر بحث آ گئے۔ اور میری رائے یہ ہے کہ ان میں کوئی مفید مطلب بات موجود نہیں۔ لہٰذا اتنا ہی بیان کافی ہے کہ ان کے ماموں محمد حاجی ساکن ست گھرا کی بیٹی سے ان کی شادی ہوئی۔ شادی کے وقت ان کی عمر ستائیس سال تھی۔ اور شادی کی تقریب کے لیے وہ ست گھرا گئے تھے اس شادی کے فوراً بعد بلکہ اس سے پہلے بھی وہ عبادت و استغفار کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ کئی کئی دن گھر سے غائب رہتے تھے اور بڑی بے چینی اور سرمستی کے عالم میں قریبی جنگلوں میں سرگرداں رہتے تھے۔ دراصل محسوس یوں ہوتا ہے کہ اگر اس وقت ان کی شادی نہ ہو چکی ہوتی۔ اور اس ذمے داری کا بار ان پر نہ پڑ گیا ہوتا تو وہ کسی رہبرِ روحانی کی تلاش میں عرب یا ایران کی طرف نکل گئے ہوتے۔ آخر ان کو اُچ کے مقام پر ایک پیر کے روپ میں اپنا ہادی مل گیا شیخ داؤد کی اس خصوصی ذہنی تبدیلی سے پہلے جو واقعات انھیں پیش آتے وہ

Marfat.com

معمولی قسم کے تھے۔ درحقیقت شیخ ابتدا ہی سے روحانی اندازِ حیات کی جانب میلان محسوس کر رہے تھے۔ اس ذہنی میلان کے لیے اخلاقی جوش اور ولولے کا ایک اور غیر متوقع سبب بھی ظہور میں آگیا۔ ہوا یوں کہ مرزا کامران کے دربار میں ایک ایرانی عالم آیا جس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ بہت بڑا ماہرِ علوم ہے۔ اس نے ہند کے ماہرِ الٰہیات و مذاہب کو بعض مختلف فیہ مسائل کے باب میں دعوتِ مناظرہ دی۔ اس مناظرے میں حصہ لینے کے لیے مرزا کامران نے دیپالپور سے ملا بایزید کو بلا بھیجا۔ شیخ داؤد ان ملا بایزید مذکور کے شاگرد تھے۔ وہ اس مناظرے کی تیاری میں استاد کی معاونت کر رہے تھے اور اس سلسلے میں لاہور کے باہر ایک باغ میں کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھے کہ ایک درویش نے انھیں مخاطب کر کے کہا اللہ! اللہ! تمھیں اللہ نے کس کام کے لیے پیدا کیا تھا اور تم کس راہ پر پڑ گئے ہو۔

یہ بات ایک ایسے نوجوان کے لیے کافی ہو رہی جس نے اپنے دل میں عزلت گزینی اور پھر تبلیغ و ارشاد کی زندگی اختیار کرنے کا پہلے ہی سے تہیہ کر رکھا تھا لہٰذا انھوں نے مطالعہ چھوڑ دیا۔ قرآن کی یومیہ ترتیل بھی ترک کر دی وہ ترتیل جس کی شیرینی و خوش آہنگی سے لطف اندوز ہونے کے لیے بے شمار لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ طالب علم کی حیثیت سے وہ صاحب کمال تھے ہی، چنانچہ اب طالب علمانہ زندگی کو خیرباد کہہ دیا۔ لباس چاک کیا اور ایک دنیادار انسان کی زندگی سے قطع تعلق کر کے اپنا مسکن جنگل کو بنا لیا۔

انھوں نے موجودہ لاہور کی بستی اچھرے میں بھی چند سال بسر کیے۔ شیخ کمال

Marfat.com

سے ان کی ملاقات جو بعد میں ان کے مرید ہو گئے تھے یہیں ہوتی تھی بعد ازاں اسی عالم میں جسے اصطلاح میں جذب کہتے ہیں وہ ایک اور جنگل کی طرف نکل گئے جو نسبتاً زیادہ خاموش تھا اور جس میں لوگوں کی آمد و رفت کم تر تھی۔ اس جنگل کا نام ہلال وال ہے۔ اب وہاں ایک گاؤں آباد ہے جو شاہراہ لاہور ملتان پر ضلع لاہور ہی میں واقع ہے اور صوبائی دارالحکومت سے کوئی پندرہ میل دور ہے۔ اُنھوں نے یہیں ایک گھنے جنگل میں اساسی عبادت اور ریاضت کی تکمیل کی۔ یہ وہ مرحلہ ہے کہ جو شخص اس کو بخوبی و کامرانی طے کرلے وہ صوفیہ کے سلسلۂ مراتب میں ایک ہادی و مرشدِ رُوحانی کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقام شدید اخلاقی تربیت و ریاضت کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ اپنے باطن کی سفلی خواہشات کا قلع قمع کر دیا جائے، ایک اعلیٰ اسلوب زندگی اختیار کیا جائے جو ضبط اور قاعدے کا پابند ہو تاکہ وہ آخر کار اپنے اندر رُوحانی انوار کو منکشف پائے۔ اس تجلّیِ انوار کے لیے بعض اوقات استغراق بھی ضروری ہوتا ہے۔ نیز لازم ہے کہ وہ گھٹیا خواہشات اور پست آرزوؤں پر کامل حکمران ہو کر انسانِ کامل کے نصب العینی مقام تک پہنچنے کے لیے کوشاں رہے۔

شیخ داؤدؒ کا مطمحِ نظر یہی تھا جو شیخ نے از روے روایت اور حسب حوالۂ مقامات داؤدی گیارہ برس کی محنتِ شاقہ سے حاصل کیا۔ تصوّف کی دنیا میں اب شیخ کا کیا مقام تھا؟ وہ بڑے جیّد عالم اور عالی مقام عارف تھے۔ لیکن تاحال وہ صوفیہ کے چار بڑے سلسلوں میں سے کسی کے ساتھ باضابطہ وابستہ نہ ہوئے تھے درویش کے ان سلسلوں کو پُورے ہندوستان میں بلکہ ساری اسلامی دنیا میں بڑے احترام

Marfat.com

کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔[1]

ان کی زندگی کے ابتدائی حصّے کا (جو انھوں نے تحصیلِ علم میں اور اسلام کے پاکیزہ قوانین کے مطابق پوری زندگی کو ڈھالنے کی مشق و ریاضت کے لیے وقف کر دیا تھا) جائزہ دو اہم مصنفوں نے پیش کیا ہے۔ میں یہاں متعلقہ فارسی تحریر کا لفظ بہ لفظ ترجمہ پیش کرتا ہوں: "(شیخ داؤدؒ) ایک ایسے شخص ہیں جو سچ مچ رُوحانی طاقتوں کے مالک اور صریح وصاف وجدان والہام کا مظہر ہیں۔ انھوں نے اتنی سخت ریاضتیں کی ہیں اور ایسی مافوق الانسان عبادات سرانجام دی ہیں اور نفسانی خواہشات وجذبات کی اس شدت کے ساتھ خلاف ورزی کی ہے کہ قلم اور زبان اس کے بیان سے قاصر ہیں۔ یوں بھی ہوا ہے کہ انھوں نے پوری پوری راتیں پہلو بدلے بغیر یادِ خُدا میں گزار دیں۔ مختصراً یہ کہ انھوں نے سلوک کی اس منزل کو مطمحِ نظر بنا لیا جو مشکل ترین مرحلہ ہے اور جسے نفس کشی کہتے ہیں۔ وہ کئی سال جنگلوں میں رہے اور اس مرحلے کو بخیر وخوبی طے کر لیا تو ان کا ذہن کاروبارِ دنیا اور اس کے متعلقہ وبال سے آزاد ہو گیا۔"

تزکیۂ نفس کے اس تربیتی مرحلے کے کامیابی سے انجام پذیر ہو جانے پر ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ تصوّف کے چار بڑے سلسلوں میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستہ ہو جاتے اور کسی ایسے مرشد کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے جس کے لیے ان کے دل میں احترام ہوتا اور اس بات سے آگاہ ہوتے کہ وہ مرشد بالیقین ایک مخصوص سلسلے سے وابستہ ہے۔ داراشکوہ نے "سفینۃ الاولیاء" میں اس امر کا ذکر کیا

---

[1] مقامات داؤدی صفحہ ۴۱ تا ۴۳

Marfat.com

ہے کہ شیخ بڑے مشہور ولی تھے اور انھوں نے ایسے رُوحانی اوصاف کا اکتساب کرلیا تھا جو ایک رُوحانی رہبر کے لیے کافی ہوں۔ تاہم انھوں نے کسی بھی سلسلۂ تصوف میں شامل ہونے سے گریز کیا۔ لہٰذا اویسی کہلانے لگے۔ اویسی درویشوں کے ایک ایسے سلسلے کا نام ہے جو سخت نفس کشی اور ریاضت کے بعد رُوحانی رہنما تو بن جاتے ہیں مگر تصوّف کے اس راستے پر ان کا کوئی ہادی نہیں ہوتا بلکہ ان رُوحانی قوتوں کو حاصل کر لینے کے بعد بھی وہ کسی سلسلۂ تصوّف کے ساتھ منسلک نہیں ہوتے۔ صُوفیۂ کرام کے نزدیک ایسے درویش لوگوں کو جب اپنے سے زیادہ طاقت ور کسی صاحبِ سلسلہ ولی کا سامنا کرنا پڑے تو ان کی روحانی ترقی وکمال کے چھن جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ درویش کسی صاحبِ سلسلہ ولی کے ہاتھ پر باضابطہ بیعت کر کے اس کے سلسلے میں شامل ہو جائیں تو وہ ان کے کمالات پر جن کا انھوں نے ذاتی ریاضتِ شاقہ سے اکتساب کیا ہوتا ہے رسماً اپنی مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔ بہرحال میں تصوّف کی اس اِصطلاحی رمز کے بیان کو طول نہیں دینا چاہتا اس لیے کہ ایک ایسی بات کا تفصیلی تذکرہ جس کے مبادیات کو بھی میں بمشکل سمجھتا ہوں میرے بس کا روگ نہیں۔ بس اتنا ہی ذِکر کیے دیتا ہوں کہ اُویسی سلسلے سے تعلق رکھنے والے درویش اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک درویش وسیلے اور سہارے کے بغیر بھی رُوحانی کمالات حاصل کر سکتا ہے۔ اُنھوں نے یہ مخصوص اسم حضرت اویسؓ سے اخذ کیا ہے جو یمن کے ایک گاؤں قرن میں رہتے تھے اور جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملے یا ان کی زیارت سے مشرف یاب ہوئے بغیر ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ داراشکوہ کے اس تائیدی بیان کی روشنی میں ہم پر

Marfat.com

واضح ہوجاتا ہے کہ پہلے پہل شیخ داؤدؒ کا درویشوں کے اویسی سلسلے سے تعلق رہا۔[1]
جب شیخ داؤد کی تعلیم مکمل ہوگئی اور اپنی عبادات و ریاضات کے بل بوتے پر انھیں حسب دلخواہ رُوحانی رفعتیں میسر آگئیں تو انھوں نے اپنے خاندان سمیت ست گھرا کی طرف مراجعت کی۔ ست گھرا میں دوبارہ سکونت اختیار کر لینے کے بعد انھوں نے اپنا اکثر وقت اس آبادی کے نواحی جنگلات میں گزارنا شروع کر دیا۔ مقامات داؤدی کے مصنف کی رائے کے مطابق جب شیخ داؤد رُوحانیت کے مقامِ عالی پر فائز تھے تو سلسلۂ قادریہ کے سیّد اولیاء شیخ عبدالقادر جیلانی نے خواب میں انھیں اپنے سلسلے میں شامل ہونے کے لیے کہا تاکہ شیخ داؤد کی شمولیت سے ان کے ہجوم درادیش کی عزت و شان میں مزید اضافہ ہو۔ تاہم شیخ داؤد نے اس معاملے میں بڑا تامّل کیا۔ اور اس لیے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے ایما پر پاک پتن والے حضرت بابا فرید گنج شکر نے انھیں سزا بھی دی۔ شیخ داؤد بارہا حضرت بابا فرید گنج شکر کے مزار پر مراقبہ و ریاضت کی خاطر حاضر ہوا کرتے تھے۔[2]
بابا فرید گنج شکر کے ہاتھوں اپنی رُوحانی رفعتوں کا نقصان کرا کے جب وہ واپس ست گھرا میں پہنچے تو انھوں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کو دوبارہ خواب میں

---

[1] صوفیۂ کرام کے سلسلوں کے ضمن میں آئین اکبری ملاحظہ ہو۔ ابوالفضل ایسے چودہ سلسلے گنواتا ہے جن میں چار مشہور سلسلے بھی شامل ہیں، وہ شیخ علی ہجویری داتا گنج بخش لاہوری کی شہرۂ آفاق کتاب "کشف المحجوب" کا حوالہ دیتا ہے۔

[2] صوفیۂ کرام اولیا کی موت کے قائل نہیں ہوتے ان کا خیال یہ ہے کہ ولی میں حیران کن طاقتیں ودیعت ہوتی ہیں۔ قرآن میں بھی اس کا ذکر موجود ہے "کہ بے شک اولیا اللہ نہیں مرتے"۔

Marfat.com

دیکھا کہ وہ انھیں اشارہ کر رہے تھے کہ اُچ میں جاکر مخدوم حامد گیلانی کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان کی بیعت کر کے سلسلۂ قادریہ میں شامل ہو جائیں[1]۔ بدایونی کے بیان کی رُو سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ شیخ مخدوم حامد گیلانی ست گھرا میں تشریف لائے تھے اور شیخ داؤد نے وہیں ان کی بیعت کی تھی۔ انھیں ایک مفرّض شجرے کی ایک نقل[2] اور بعض دیگر ایسی چیزیں دی گئیں جو ایک ہادیِ دین کی شان کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ بہر حال شیخ داؤد سلسلۂ قادریہ کے ایک رکن بن گئے۔ اور اب وہ اپنی جُداگدّی قائم کر لینے کے مستحق تھے جہاں سے وہ اشاعتِ اسلام اور رُوحانی تربیت و تدریس کا سلسلہ جاری رکھ سکتے۔ اصطلاح میں یُوں کہہ لیجیے کہ اب وہ صوفیہ کے سلسلۂ قادریہ میں شیخ حامد گیلانی کے خلیفہ بن گئے تھے۔

---

[1] گزیٹیر بہاول پور ص ۱۶۴، بدایونی ۳ ص ۳۱، [2] کاغذ یا کپڑے کا ٹکڑا جس پر پیران سلسلہ اور ان کے خلفا کے اسمائے گرامی درج ہوتا ہے۔

Marfat.com

پانچواں باب

شیخ داؤدؒ کی قیام گاہِ شیر گڑھ

شیر گڑھ کی تاریخ اور ماحول

شیخ داؤدؒ کے اوصاف و کمالات

اس مرحلے پر ہمیں اس امر سے آگاہ رہنا چاہیے کہ شیخ داؤد نے اپنے خاندان سمیت ست گھرا کو ترک کر کے شیر گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ اس اقدام پر شاید اس لیے راضی ہوئے کہ ان کے ننہالی رشتے دار سب کے سب ست گھرا کی سکونت ترک کر کے شیر گڑھ میں آباد ہو گئے تھے۔

اس نقلِ مکانی کی کئی تعبیریں کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً شیخ داؤد کا مزاج رکھنے والے آدمی کے لیے یہ جگہ خود اپنی ذات میں بڑی دلآویز تھی۔ یہ گاؤں ایک بلند ٹیلے پر آباد ہے۔ یہ بلند ٹیلا ان بلند ٹیلوں کے سلسلے میں سے ہے جن کے درمیان سے کسی زمانے میں دریائے بیاس گزرتا تھا۔ یہ مقام اور بھی کئی خوبیوں کا مالک ہے۔ جو صوفیہ کے لیے کشش کا باعث ہو سکتا ہے۔ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ جنگل کے سرے پر واقع ہے۔ شیخ کے بعد یا ممکن ہے اس کے زمانے ہی میں اس جگہ کو گنجی بار کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ ظاہر ہے کہ ایک خشک جھاڑی والا

Marfat.com

اور ویران جنگل ایک صوفی کے لیے سب سے موزوں اور مناسب مقام ہے دریائے راوی کے آس پاس کی جگہ کو تو لامحالہ گنجان آباد اور معمور ہونا ہی تھا اس لیے اسے چھوڑ کر شیخ داؤد نے ایک ویران جگہ کو پسند کر لیا۔ اس طرح ست گھرا کی وہ حیثیت ختم ہو گئی جو ایک گدّی اور رُوحانی تعلیم و تربیت کا مرکز ہونے کی حیثیت سے اسے حاصل ہونی چاہیے۔

شیر گڑھ کی بستی لاہور اور ملتان والی شاہراہ سے دُور تھی اور اس طرف لوگوں کی آمد و رفت بہت کم تھی۔ شیخ داؤد جیسے شخص کے لیے جو ایسے لوگوں سے دور رہنے کا خواہش مند ہو جو باعثِ تضیع اوقات ہوں یہ جگہ اور بھی زیادہ مناسب تھی۔ یہاں وہ لوگوں کی ملاقاتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے صوم و صلوٰۃ میں وقت صرف کرنا زیادہ مفید جانتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں ست گھرا میر چاکر رند سے چھن گیا تھا۔ میر چاکر وہاں ایسے جملہ اختیارات کا مالک تھا جو کسی بھی جاگیر دار کو میسر آسکتے ہیں لیکن وہ وہاں کے باشندوں کے تحفظ بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب میر چاکر رند کا انتقال ہو گیا اور اس کی سرپرستی جاتی رہی تو شیخ داؤد کے ننھیالی رشتہ داروں نے یہی بہتر جانا ہو گا کہ کسی زیادہ محفوظ مقام کی طرف نکل چلیں۔

اب ہم میر چاکر رند کی جانب لوٹتے ہیں اور اسے جو مقامی اہمیت حاصل تھی اس کا سرسری جائزہ لیتے ہیں[1]۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقامی سردار دراصل سبّی کے علاقے سے آیا تھا اور قوم کا بلوچ تھا۔ دشمنوں نے اسے پریشان کر رکھا تھا، علاقائی حالات غیر یقینی تھے۔ لہٰذا گمان یہ ہے کہ اس میں وہاں ٹھہرے رہنے کی تاب نہ تھی۔ چنانچہ اس نے لنگاہوں کے دورِ عروج میں ملتان کی راہ لی۔ مگر انتہائی کوشش کے باوجود

[1] طبقات اکبری ص ۶۴۵ - فرشتہ ص ۳۹۶

Marfat.com

وہاں بھی اس کے پاؤں نہ جم سکے۔ اس ناکامی کا باعث سہراب ڈوڈائی تھا جسے لنگاہوں کے یہاں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ ناکامی کے بعد میر چاکر نے شور کوٹ کے جام بایزید سے دستگیری چاہی۔ جس نے اپنے علاقے کا ایک قطعہ میر چاکر کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اپنے بلوچ جوانوں کی مدد سے وہاں اپنی سرداری قائم کرے، یہ قطعہ ست گھرا اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اس مرحوم بلوچ سردار کا مقبرہ تاحال وہاں موجود ہے، اور میں نے خود بھی اُسے دیکھا ہے۔ میر چاکر کا صدر مقام تو ست گھرا ہی رہا۔ لیکن اس نے اس علاقے میں موزوں مقامات پر جنگی اہمیت کی چوکیاں قائم کر رکھی تھیں۔ ان چوکیوں کا مقصد ایک تو یہ تھا کہ ان کے ذریعے نامشخص دشمنوں کی راہ روکی جا سکے اور دوسرے یہ کہ چوروں اور رہزنوں پر نظر رکھی جا سکے، اور علاقے میں امن قائم رکھا جا سکے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شیر گڑھ میں بھی ان پاسبانوں کی ایک چوکی تھی۔ یہاں ایک بڑا تھانہ بھی تھا جہاں میر چاکر نے شہر کی حفاظت کے لیے بلوچ لشکر مقرر کر رکھا تھا۔ ایسی چوکی کو چور چوکی یا تھانہ کہتے تھے۔ شیر گڑھ کی دفاعی اہمیت اس قسم کے قیاس کی تصدیق کرتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے یہ گاؤں گنجی بار کے سرے پر واقع ہے۔ جہاں ٹیلے آ کے نشیبی زمین کے خطوں سے ملتے ہیں۔ یہاں چوکیوں کا نظام خصوصی طور پر مفید تھا اس لیے کہ ان ڈنگر چوروں کے لیے یہ جگہ پڑاؤ کا کام دیتی تھی جن کو ستلج یا راوی کی طرف آنا جانا ہوتا تھا۔ پنجاب میں مال مویشی کی چوری چکاری انگریزوں کے زمانے تک جاری رہی۔ بلکہ یہ سلسلہ اب بھی (۱۹۳۰ء) جاری ہے۔ اگرچہ واضح طور پر پہلے سے کم ہے۔ اگر ہم ان دریاؤں کے درمیان اُن سے چھوٹے سے چھوٹے فاصلے پر

Marfat.com

ٹھہرنا چاہیں تو وہ مقام شیر گڑھ ہی ہوگا۔ کیونکہ وہ ان دو دریاؤں کے عین وسط پر واقع ہے اس گاؤں سے دریائے راوی بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے، دریائے ستلج کا فاصلہ بھی اس سے قریباً اتنا ہی ہے۔ عسکری اعتبار سے اس گاؤں کی اہمیت نے صاحب مقامات داؤدی کے قلم سے ایک فقرہ لکھوا دیا ہے جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے "شیر شاہ سوری کے ایام میں شیخ داؤد کی آمد سے پہلے میر حاجی نے ایک فوج مقرر کر رکھی تھی جس کا کام یہ تھا کہ وہ ملتان کی طرف جانے اور وہاں سے آنے والوں کی امکانی شرانگیزی کے خلاف اس علاقے کی حفاظت کرے۔ ان محافظوں نے اس چوکی کے گرداگرد مٹی کی دیواریں کھینچ دی تھیں اور اس کا نام شیر گڑھ رکھ دیا تھا"[1]

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ گاؤں شیر شاہ سے منسوب ہے یہ نہ صرف تھانہ تھا بلکہ ایک قلعہ بھی تھا۔ قلعے کے آثار ابھی تک موجود ہیں اور اس کی تعمیر کرنے والے کا نام فتح جنگ خان بتایا جاتا ہے جسے شیر شاہ نے ملتان کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اسی حاکم نے اس چوکی کا نام اپنے بادشاہ کے نام کی مناسبت سے شیر گڑھ رکھا تھا۔

گویا مقامی تاریخ اور روایت کی چور چوکی شیر شاہ کے زمانے کا شیر گڑھ ہے۔ اس قلعے کا مقصد راوی اور ستلج کے شورش پسند قبائل کو ڈراتے اور دباتے رکھنا تھا چنانچہ اس قلعے کے اردگرد ایک بستی بھی آباد کر دی گئی ہوگی۔ بظاہر یہ قلعہ کسی بیرونی خطرے کے مقابلے کے لیے تعمیر نہیں کیا گیا تھا۔

جب بابر کا انتقال ہوگیا اور ہمایوں کے پاؤں ہندوستان میں نہ جم سکے تو شیر شاہ سوری ہی ہندوستان کی مرکزی قوت بھی تھا اور بادشاہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] تاریخ شیر شاہ۔ ایلیٹ ج۲ ص ۲۹۸، ۹۹ از عباس خان شاروانی ترجمہ سر ایچ ایلیٹ

Marfat.com

میر جاکر رند کسی وقت شیر شاہ کے عہد میں مارا گیا۔ اس کا انجام جو بھی ہوا ہو یہ بات یقینی ہے کہ شیر شاہ کے حکم کی تعمیل میں لاہور کے گورنر ہیبت خاں نیازی کے زیرِ قیادت پہاڑی پٹھانوں نے بلوچوں پر ہلّہ بول دیا اور ست گھرا اور اس کے گرد و نواح میں بلوچوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح میر جاکر کا دورِ حفظ و امن لد گیا، معلوم ہوتا ہے کہ اب شیخ داؤد اور ان کے رشتے داروں کے لیے شیر گڑھ کے نئے گاؤں کی طرف منتقل ہو جانا ضروری ہو گیا تھا۔ یہ نیا ڈیرہ ان کی ترک کردہ بستی سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر تھا۔[1]

سوریوں کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ لمبا عرصہ ہندوستان کے فرمانروا نہ رہیں۔ ہمایوں نے جلد ہی شیر شاہ کی اولاد سے ہندوستان چھین لیا۔ اور اپنے بعد اسے اکبر کے لیے چھوڑ گیا۔ مگر ابتدا میں اکبر کے قبضہ و اقتدار کی چولیں ڈھیلی تھیں اور صحیح معنوں میں حکمران بننے کے لیے اسے ایک سنگین جد و جہد سے گزرنا پڑا۔ عہدِ اکبری میں شیر گڑھ کا یہ چھوٹا سا گاؤں لکھی بابا بھوج کے پرگنے کی (جو دیپالپور سرکار اور ملتان کے صوبے میں شامل تھا) جاگیر بن گیا۔

یہ حقیقت مجھ پر ان تمسکات کے مطالعے سے کھلی جو انتقال اراضی کے سلسلے میں مغلوں کے زمانے میں لکھے گئے تھے۔ یہ تمسکات میری ملکیت میں ہیں اور مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح جہاں شیر گڑھ کی تاریخ مکمل ہو جاتی ہے وہاں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ مقامی اور سیاسی حالات کیا تھے جن کے باعث شیخ داؤد کو شیر گڑھ

[1] بدایونی اس کو نیا گاؤں کہتا ہے۔ ملاحظہ ہو منتخب التواریخ III ص ۲۱

Marfat.com

میں آباد ہونا پڑا۔ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب وہ پہلے پہل وہاں آباد ہوئے تھے تو اُنھوں نے کیا دیکھا تھا؟ یہ گاؤں تین قبائل کی ملک تھا۔ ایک ڈھول دوسرے کلہار اور تیسرے قریشی۔ شیخ داؤد نے وہاں پہنچ کر گاؤں کے نمبرداروں سے زمین کا ایک ٹکڑا خرید لیا۔ جس میں ایک کنواں بنوایا، ایک مسجد تعمیر کی اور ایک مکان اپنے سر چھپانے کو کھڑا کیا۔ جب شیخ داؤدؒ شیر گڑھ میں آباد ہوئے تو وہ سوریوں کا عہد حکومت تھا۔ اور سلیم شاہ سوری سلطانِ وقت تھا۔ شیخ داؤد زندگی کے بقیہ دن یہیں بسر کر دینا چاہتے تھے اور پیشِ نظر یہ تھا کہ اپنے آپ کو دین کی سرگرم خدمت میں گم کر دیں۔ چنانچہ ایک گوشۂ رشد و ہدایت کے جملہ لوازمات وہاں جمع کر لیے اور سلسلۂ قادریہ کی گدی قائم کر دی۔ ملاقاتیوں کے لیے اور رُوحانی تربیت پانے والوں کی سکونت اور خوراک کے لیے لنگر بھی جاری کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے پاس کوئی جائداد اور اثاثہ نہ تھا۔ ان کا سب سے بڑا ذریعۂ آمدن وہ ہدیے اور نذرانے تھے جو نقدی یا دوسری صُورت میں مریدوں کی جانب سے پیش کیے جاتے تھے۔ جو روپیہ اس طرح حاصل ہوتا تھا وہ لنگر کے اہتمام پر خرچ ہوتا تھا۔ اس لنگر کے تحویلدار طبّاخ کا نام میر قیّاد معلوم ہوتا ہے۔

مختصر قیام کرنے والے مریدوں کی رہائش اور خوراک کا اہتمام کرنے کے علاوہ ان مریدوں کی بھی جملہ ضروریات کا بندوبست کرنا پڑتا تھا۔ جو شیخ کے پاس طویل عرصے تک ٹھہرے رہتے تھے تاکہ نفس کشی، اخلاقی آداب اور دینی تعلیم حاصل کر سکیں۔ شیخ کے تکیے کے اردگرد کی عمارتوں کو دیکھتے ہوتے مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ روزانہ حاضر ہونے والے ارادتمندوں کی تعداد خاصی بڑی ہوتی ہوگی اور

Marfat.com

وہ لوگ بھی تعداد میں کم نہ تھے جو چاہتے تھے کہ ہمیشہ اپنے ہادی و مُرشد کے قدموں میں رہیں اور جنھوں نے جُدا جدا حجروں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ داؤد نے درزی اور دھوبی بھی ہمہ وقتی طور پر ملازم رکھے ہُوئے تھے۔

شیخ کی زندگی کے باقی تیس سال تبلیغِ اسلام اور دعا و عبادات کے لیے وقف رہے، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حصُولِ مقصد کے بعد بھی عبادات جاری رہنی چاہئیں یُوں بھی ہوتا تھا کہ شیخ لگاتار چھ چھ ماہ روزے رکھتے چلے جاتے اور افطار کے وقت نہایت معمولی سی غذا کھاتے۔ ان کی خوراک بہت کم تھی اور پہناوا بڑا ہی سادہ تھا اس باب میں بدایونی کا بیان ہے کہ انتہائی لاغری کے باعث انھیں گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر تک پالکی میں ڈال کر پہنچایا جاتا تھا۔ خود میں نے بھی راستے کا ایک حصّہ، پالکی کو کاندھا دیا۔[1] مختصر یہ کہ خواہ وہ لاہور میں تھے خواہ ست گھرا میں اور خواہ شیر گڑھ میں انھوں نے اپنی زندگی صحرا نشینی میں بسر کر دی یا شریعت مُقدسہ کے مطابق عبادت کرنے اور روزے رکھنے میں بسر کر دی۔ نقل کیا گیا ہے کہ مذہبی بحثوں کے دوران میں ان کے دل پر یکایک اداسی سی مسلّط ہو جاتی اور وہ اچانک اس جنگل کی راہ لیتے جو شیر گڑھ ست گھرا کے مابین واقع تھا اور پھر کئی کئی دن بغیر خوراک کے بسر کر دیتے۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ اپنے سر کے بال اُسترے سے بالکل صاف کرا دیتے تاکہ گاؤں کے لڑکوں بالوں کو انھیں کنکریاں مارنے کی ترغیب ہو اور وہ ان کا ٹھٹھا اڑائیں تاکہ ان کی اَنا ختم ہو جائے۔ لیکن اگر بچّے انھیں ایک پاک اور مقدس شخص جان کے آمادۂ توہین نہ ہوتے تو انھیں خُود فراموشی کے دورے پڑنے لگتے اور وہ گھوڑے پر سوار جنگل

[1] بدایونی ۲ ص ۳۵

Marfat.com

کا رخ کرتے تاکہ مکمل تنہائی کے عالم میں عبادت کر سکیں۔ چند روز کے بعد ان کے احباب ان کی تلاش میں نکلتے اور انھیں کسی جھاڑی میں چھپا یا کسی ٹیلے کی پشت پر پڑا پاتے، دُنیا سے دُور اور اس کی ساری چہل پہل اور سرگرمی سے پرے اور یکّہ و تنہا۔ بہرحال وہ لوگ انھیں واپس لے آتے اور وہ از سرِ نو تازہ دم ہو کر وعظ و تبلیغ کا کام شروع کر دیتے۔

بیان بالا کی تصدیق ایک اس واقعے سے بھی ہوتی ہے جو مقاماتِ داؤدی میں منقول ہے۔ ان کے گاؤں میں ایک مغنّی تھا جسکا نام ولیا تھا۔ ایک روز وہ اپنے کسی ساز کی دُھن پر گاتا ہوا شیخ داؤد کے مکان کے پاس سے گزرا۔ گانے کا مفہوم یہ تھا کہ میں نے مقدس بزرگوں کی بارگاہوں پر قربانیاں پیش کیں اور چڑھاوے چڑھاتے تھے، جب کہیں میرا محبوب، میرا رانجھا، میرے گھر آیا تھا اور پھر میں نے اس کے ساتھ بیاہ رچا لیا۔ میں نے کسی قاضی اور مُلّا کو نہ بُلایا کہ آ کے اسلامی شریعت کے مطابق عقدِ نکاح باندھے۔ جونہیں شیخ کے کانوں میں یہ بول پڑے انھوں نے گھر سے نکل کے جنگل کی راہ لی اور کئی دن تک وہیں گھومتے رہے۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس گانے نے انھیں یہ یاد دلا دیا کہ انھوں نے آغازِ حیات میں رُوحانی ترقی و کمال کی نعمت حاصل کر لی تھی، حالانکہ انھوں نے کسی ہادی و مرشد کا دامن نہ پکڑا تھا۔ جو انھیں خُدا کی راہ پر ڈال دیتا۔ یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے کہ زندگی کے ابتدائی حصّے میں وہ اویسی تھے۔

شیخ کو زندگی کا یہ لائحہ عمل جاری رکھنے کے لیے لوگوں کی شدید عداوت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ خود صُوفی تھے، کوئی متعصّب فرقہ پرست نہ تھے، شیر گڑھ

Marfat.com

کے اردگرد چند طاقت ور اور با اثر آدمیوں کا گروہ تھا۔ انھیں یہ بات پسند نہ آئی تھی کہ ایک عالم مگر درویش شخص خواہ مخواہ ان کے اثر و رسوخ میں خلل انداز ہو۔ شیخ کے روحانی کمالات کے ساتھ ساتھ ان کی پاکیزگی، خدا ترسی اور سادگی کا چرچا اور شہرہ نہ صرف پرگنے، سرکار اور صوبے میں ہونے لگا بلکہ یہ چرچا پورے برعظیم میں پھیل گیا۔ اکبر کے زمانے میں ان کی شہرت پورے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی حالانکہ اس زمانے میں تعارفِ ذات کے وسائل و ذرائع بڑے ناقص تھے۔ بہرحال ہندوستان بھر میں مشہور ہو جانے کی وجہ سے کئی چھوٹے بڑے آدمی ان کے حلقے میں آکر بیٹھنے لگے اور وہ ہزارہا افراد کے مسلّمہ پیر اور روحانی راہنما بن گئے۔ یہ بات کہ وہ اتنے صاحب اثر و رسوخ ہو گئے تھے اور اتنے آدمی ان کے عقیدتمند تھے نیز یہ کہ انھوں نے دلوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی ایک مقامی سردار میر سید علی بشیر کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ میر سید علی بشیر شیر گڑھ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر حسن گڑھ میں رہتا تھا۔ وہ شیخ داؤد کا دشمن ہو گیا۔ اسے اس بات پر حسد تھا کہ لوگ شیخ کو بغیر عہدہ و منصب بھی اس قدر احترام و ارادت کی نظر سے کیوں دیکھتے ہیں۔ سید بشیر علی پرگنہ بابا بھوج کا جاگیردار تھا اور شیر گڑھ اسی پرگنے میں شامل تھا۔ آخر اس نے ایک آوارہ گروہ کی جنھیں کاردزن کہتے تھے خدمات حاصل کر لیں تاکہ وہ شیخ کو ٹھکانے لگا دیں۔ یہ لوگ خراسان سے میر سید بشیر علی کے یہاں آتے تھے اور مذہباً کٹر شیعہ تھے ان لوگوں نے شیخ کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن وہ اس لیے ناکام رہی کہ شیخ کو ان کے بھتیجے نے قبل از وقت اس سے خبردار کر دیا تھا۔

شیخ کے اثر و رسوخ، خدا ترسی اور اخلاق و کردار کی بلندی نے لوگوں کے

Marfat.com

دلوں میں اس طرح گھر کر لیا کہ تیس سال کے مختصر سے عرصے میں ان کے مریدوں میں فقط نو مسلموں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ مبلغ تو تھے ہی مگر ان پڑھ اور بے ہادی مسلمانوں کے معلّم بھی تھے۔ یہ لوگ اُن کی بارگاہ پر حاضری کا شرف حاصل کرتے اور اطمینان و سکون کی دولت سمیٹتے تھے۔

بدایونی کی شہادت سے ہمارے بیان کے حصۂ اوّل کی تاریخی طور پر تصدیق ہو جاتی ہے۔ بدایونی ان آدمیوں میں تھا جو خود شیر گڑھ پہنچے اور شیخ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ اس نے بیرم خاں خانخاناں کے زمانے ہی میں شیخ داؤد جھنّی وال کا چرچا سن لیا تھا جس سے ان کے دل میں ان کے دیدار کا شوق چٹکیاں لینے لگا تھا۔ آخر جب وہ آگرے میں زیر تعلیم تھا تو شیخ سے ملاقات کا جذبہ و شوق جو بارہ سال سے مکینِ خاطر تھا اسے کشاں کشاں لاہور سے شیر گڑھ لے گیا جہاں وہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے شخصی جمالِ بے مثال سے بہت مُتاثر ہوا۔ جب وہ مُسکراتے تو ان کے دو بالائی دانتوں سے نُور کی کرنیں پھوٹتی تھیں اور دیکھنے والوں کے دلوں کو منوّر کر دیتی تھیں۔ بدایونی تین چار روز شیخ کے یہاں مقیم رہا۔ اور اس نے دیکھا کہ کوئی دن خالی نہیں جاتا کہ سَو پچاس ہندُو اپنے کنبوں سمیت حاضر ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت نہ کریں اور دائرۂ اسلام میں داخل نہ ہوں۔

یہ معاصر تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے ایک شخص کا بیان ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شیخ داؤد کی شہرت و ناموری نے سیکڑوں افراد کو حلقہ بگوش اسلام ہونے کی ترغیب دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ معلّم دین تھے

Marfat.com

نومسلموں کی کئی الگ الگ روایات اوران کے اسلاف کے احوال سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ان احوال کی روشنی میں شیخ داؤد کے مقام کو ان مسلمان مبلغوں میں متعین کرنے میں بھی مدد ملتی ہے جنھوں نے برّصغیر کی ہندو آبادی کو بجبر واکراہ نہیں بلکہ ترغیب و تبلیغ سے دائرۂ اسلام میں داخل کیا۔ ویسے بھی فقرا کے پاس جبر واکراہ کے وسائل ہوتے کہاں ہیں مقاماتِ داؤدی میں کئی ایسے واقعات بھی درج ہیں کہ ہندو لوگ شیخ کے ہاتھ پر بیعت کر کے رضا کارانہ طور پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے اس طرح خود بخود شیخ ہی کے مریدوں میں بھی شامل ہو گئے۔

شیخ کے دل میں اشاعتِ اسلام کا جذبہ وشوق کس قدر تھا اس کا اندازہ قبولِ اسلام کے دو واقعات سے ہو جاتا ہے۔ایک واقعہ راے مانک کا قبول اسلام ہے۔ راے مانک ایک جوہری تھا اور اس نے اسلام قبول کرنے سے حتماً انکار کر رکھا تھا مگر آخر کار شیخ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ دوسرا واقعہ اس سے زیادہ دلچسپ ہے۔ یہ سدّھو بھٹی کا قبول اسلام ہے۔اس کا نام کوہلہ تھا اور وہ ضلع ساہیوال میں دریاے راوی کے قریب رہتا تھا۔شیخ داؤد تک یہ بات پہنچی تھی کہ کوہلہ نامی ایک ہندو نے بہت سی اراضی پر قبضہ کر رکھا ہے جو اس نے اپنے مویشیوں کے لیے چراگاہ کے طور پر مخصوص کر رکھی ہے اور جہاں وہ دوسروں کے مویشیوں کو چرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ شیخ تک یہ شکایت بھی پہنچی وہ اڑوس پڑوس میں رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے اور انھیں مذہبی تعصب کے باعث اذان بھی نہیں دینے دیتا۔ یہ مقام آج کل جسے کوہلہ کہتے ہیں شیر گڑھ سے پچیس میل کے

Marfat.com

فاصلے پر ہے۔ شیخ اس متعصب ہندو زمیندار کے گاؤں تشریف لے گئے اور اسکے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کنوئیں پر وضو کیا اور پھر بآواز بلند اذان دی۔ کوہلہ اپنے بیٹوں سمیت دوڑا آیا تاکہ ایسے نافرمان شخص کو قتل کر ڈالے۔ لیکن جب وہ شیخ کے قریب پہنچا تو ان کے وقارِ بے نیاز اور موت سے ان کی بے پروائی اور بیباک اسلوب سے بہت ہی متاثر ہوا۔ کوہلہ کی اس اثر پذیری سے شیخ نے فوراً فائدہ اٹھایا اور ایک طاقت ور نومسلم کا دائرۂ اسلام میں اضافہ کر دیا۔ صرف اس ایک شخص کے قبول اسلام کے باعث شیخ کے خاندان کے مریدوں میں کم از کم ایک ہزار کا اضافہ ہوا۔ کوہلہ کی اولاد شیخ داؤد کی معتقد ہے اور اس نے چند ایکڑ زمین اور ایک کنواں شیخ کے مزار کے لیے وقف بھی کر رکھا ہے۔ کنواں آج تک موجود ہے اور میں نے خود وہ کنواں دیکھا ہے۔ میں نے کوہلہ سردار کے قبول اسلام کی یہ کہانی اس کے اخلاف کی زبانی بھی سُنی ہے علاوہ ازیں اس خاندان کی موروثی دستاویزات میں بھی اس واقعے کا ذکر موجود ہے۔

جہاں تک شیخ کی عادات و خصائل کا تعلق ہے یہ کہنا پڑتا ہے کہ شیخ مسلمانوں کی بہ نسبت جینیوں اور نصرانیوں سے زیادہ قریب تھے۔ وہ کسی انسان یا حیوان کو اذیت دینے کے قائل نہ تھے اور اس اصول پر شدت سے کاربند تھے ان کے دل میں کسی کے خلاف کینہ نہ تھا۔ منقول ہے کہ میر سیّد علی بشیر نے شیخ کو قتل کرانے کی ٹھانی تھی لیکن شیخ نے اس سے بھی درگزر کیا۔ وہ میر سید علی بشیر کی موت کے بعد اس کی قبر پر گئے اور اس کے لیے دُعائے مغفرت کی۔ وہ اپنے جملہ مریدوں کو بھی انھیں خطوط پر چلنے کی ہدایت کرتے تھے اس سے مترشح ہے کہ وہ ہر قسم کی اذیت رسانی سے سخت بیزار تھے۔ شیخ امن، اخوت اور عفو و درگزر کے پیامبر تھے۔

Marfat.com

شیخ نے پاکبازی اور نفس کشی کو زندگی کا شعار بنالیا تھا۔ لہٰذا وہ ہر ایسی ملک سے بیزار تھے جو انھیں دنیوی رشتہ و پیوند کا پابند کر سکتی تھی۔ مقامات داؤدی میں مذکور ہے کہ ایک دن وہ اپنے لگائے ہوئے چند درختوں کی چھاؤں میں قیلولہ فرما رہے تھے کہ ایک راہرو نے کہا "شیخ نے اس جگہ کو کیا خوش گوار بنایا ہوا ہے اور ان کے درخت کتنے سایہ دار ہیں"۔ شیخ نے یہ جملے سُنے تو درختوں کو کاٹ ڈالا۔ کیونکہ راہرو کے الفاظ "اُن کے درختوں" سے ملکیّت کا احساس ہوتا تھا اور دُنیا داری کی بو آتی تھی اور پھر یہ کہ یہ قبضہ ہے ان چیزوں کا جن کی مدّتِ عمر بھی نہایت مختصر ہوتی ہے لہٰذا ان کو ناگوار گزرا کہ کسی آنی جانی چیز کی ملکیت اُن سے منسوب کی جائے۔ وہ اس سے بیزار تھے کہ کوئی کہے کہ فلاں چیز کا مالک داؤد ہے"۔ وہ قرآن کی اس معروف آیت پر عمل پیرا رہے۔ "بیشک تمھارا مال اور تمھاری اولاد تمھارے لیے بہت بڑی آزمائش ہیں"۔

بدایونی نے چند روز شیخ کے یہاں قیام کر کے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس گاؤں کا پتا پتا بوٹا بوٹا بلکہ ہر اینٹ نورِ خداوندی سے معمور تھی اور خدائے واحد لم یزل کی مناجات کہتی تھی[1]

اس کے باوصف کہ ان کی خدمت میں روزانہ نقد نذرانے اور ہدیے پیش کیے جاتے تھے انھوں نے کبھی بھی دولت جمع نہیں کی۔ نذرانوں کی صورت میں اُنھیں جو کچھ دستیاب ہوتا وہ غریبوں، محتاجوں، لنگر کے مہمانوں اور ان مسافروں پر خرچ کر دیتے تھے جو دورانِ سفر میں تہی دست ہو کر رہ جاتے۔ بدایونی نے اس معاملے میں بھی رائے ظاہر کی ہے وہ کہتا ہے "شیخ کی نفس کُشی اور دریا دلی کا عالم یہ تھا کہ سال میں

[1] بدایونی ج ص ۳۵

Marfat.com

دو تین بار ہر وہ شے جو اُن کے پاس ہوتی خواہ نقد خواہ جنس غربا میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ان کی اور ان کی اہلیہ کی ملکیت مٹی کا ایک مرتبان، ایک پرانا مصلّیٰ اور سر چھپانے کو ایک کمرہ تھا۔ جب بھی انھیں احساس ہو جاتا کہ ان کے پاس نذرانے اور ہدیے جمع ہونے لگے ہیں وہ اپنا یہ عمل تقسیم دہرا دیتے تھے۔"[1]

شیخ داؤد خدا ترس، زاہد اور متقی تھے، مگر انھیں تساہل اور کاہلی سے نفرت تھی۔ وہ اپنے مریدوں اور شاگردوں کو زندگی کی جدّوجُہد میں مستعد رہنے اور اپنی دنیوی حالت کو بہتر بنانے کی تلقین کرتے رہتے تھے مگر وہ ساتھ ساتھ اس امر پر بھی زور دیتے کہ اس فنا پذیر دُنیا کے مال و منال کے حصُول کی کوشش میں اللہ تعالےٰ کو فراموش نہ کر دیں۔ وہ یہ مان ہی نہ سکتے تھے کہ کوئی شخص جو اپنے لیے بھی دنیاوی جدّوجُہد سے جی چُراتا ہے، وہ ذاتِ باری تعالےٰ تک رسائی حاصل کرنے میں جو ہر صوفی کا مطمح نظر ہے، کامیاب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ذاتِ باری تک رسائی حاصل کرنے والے کو بڑی شدید محنت، ریاضت، نفس کشی اور قربانی کرنی پڑتی ہے۔ شیخ داؤد اس کے مخالف تھے کہ ان کی سعی و عمل اور سوانح اور کمالات کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ یہ چرچا عام تھا کہ انھوں نے اپنے بھتیجے حضرت شاہ ابو المعالی کو اپنے بارے میں کچھ بھی لکھنے سے حُکماً روک دیا تھا۔

شیخ داؤد بعض مخصوص نظریات کے مالک تھے جو ان کے کبھی کبھار کہے جانے والے اشعار سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند اشعار آج بھی باقی ہیں اور ان کے تصوّرات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے فرمایا تھا کہ داؤد نے اپنے آپ کو

---

[1] بدایونی ص ۳۲، ۳۳

Marfat.com

اِسم اور رَسم کی پابندیوں سے آزاد کر لیا ہے۔ کیونکہ تصوّف ہر رنگ اور امتیاز کو مٹا دیتا ہے۔

ان کو نمود و نمائش اور خوشامد سے نفرت تھی۔ وہ دُعا کی تاثیر کے شدّت سے قائل تھے۔ اور ان کے نزدیک وقت کا بہترین مصرف عبادات و مناجات تھا۔ ان کا فلسفۂ زندگی ان کے اشعار سے واضح ہو جاتا ہے جو اکثر ان کے وِردِ زبان رہتے تھے، مثلاً وہ شعر جن کا مفہوم یہ ہے "جو شخص اپنے آپ کو دنیوی ہنگاموں سے آزاد نہیں کر سکتا اس کا ماتم کرنا چاہیے۔ اس کا ماتم بھی کرنا چاہیے جو کسی دنیوی منصب کے ٹھاٹھ باٹھ سے اپنے آپ کو وابستہ کر دیتا ہے۔ ایک صُوفی کا گراں بہا اثاثہ صرف وقت ہے۔ اگر وہ اُسے ضائع کرتا ہے تو پھر اس صُوفی کا بھی ماتم کرنا چاہیے۔"

عہد اکبری میں ہر کوئی شیخ داؤد کو ایک عظیم رُوحانی اور باکمال ولی مانتا تھا۔ اگرچہ انھوں نے دنیا و مافیہا سے بے خبر اور صُوبائی صدر مقام سے دور تنہائی میں زندگی بسر کر دی اور کبھی نمود و نمائش کے قریب نہ پھٹکے اس کے باوصف شیر گڑھ میں مقیم ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد اُن کی شہرت پُورے ہندوستان میں پھیل گئی حالانکہ اس وقت رسل و رسائل اور تشہیر کے سریع ذرائع و وسائل نایاب تھے۔ ان کی شہرت کی بدُولت ان کی قیام گاہ علما و مؤرّخین صُوفیہ و سلاطین کا مرجع بن گئی۔ اگرچہ وہ حتی الوسع ان سے دُور رہنے کی کوشش کرتے رہتے تھے تاہم یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے شیخ داؤد کو ان کے حقیقی رنگ میں متعارف کرایا ہے۔ شیخ کے متعلق بہت سی باتیں ابھی پردۂ خفا میں ہیں لیکن جہاں تک تاریخ و روایت کو ہم آہنگ کر کے اس سے کسی

Marfat.com

مُفید مطلب اطّلاع کا حصُول ممکن ہے۔ بڑے اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ داؤد نے وعظ و تبلیغ کے میدان میں جلیل القدر کارنامہ سرانجام دیا ہے اور یہی ایک کارنامہ انھیں اس بات کا مستحق بنا دینے کے لیے کافی ہے کہ آئندہ نسلیں انھیں محبت سے یاد کریں۔

بیان بالا کی موجودگی میں کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں کہ شیخ داؤد کے گرد ایسے لوگوں کا ہر دم ہجوم رہتا تھا جو یا تو کسی قسم کی رُوحانی تسکین کے حصُول کی خاطر آتے ہوتے تھے یا ان کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کرنے کی نیت سے۔ اگر شیخ کے فقط انھیں مریدوں کے اخلاف کو گنا جائے جو شیخ ہی کے ہاتھ پر اسلام لاتے اور ان مسلمانوں کی اولاد کو شمار نہ کیا جائے جو محض اطمینان خاطر کے حصُول کی خاطر ان کے مرید ہُوئے تو جب بھی پنجاب کے مختلف اضلاع و اقطاع میں پائے جانے والے ایسے افراد کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہوگی جو انھیں کی بدولت مسلمان ہیں۔ آئندہ کی کسی ممکنہ متبادل دلیل کی گنجائش رکھتے ہُوئے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ داؤد اکبری عہد کے بہت بڑے مبلغ اور معروف رُوحانی مُرشد تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان کی بدولت مسلمان ہونے والوں کا صحیح تخمینہ اور شمار ممکن نہیں تاہم چند ایسے قبائل کا تعیُن ممکن ہے جو شیخ کی اولاد کو نہایت عزت و احترام اور عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ شیخ داؤد کے دعوے کے مطابق جو قبائل کلّی یا جزوی طور پر ان کے مرید ہُوئے اور انھیں کی بدولت دائرۂ اسلام میں داخل ہُوئے وہ یہ ہیں۔ ضلع گوجرانوالہ میں وِرک، چھٹے، نارڑ، سنجرا، دھونار، چیمے، وڑائچ، گرہاتے مان، سانسی اور کچھ اور کمین قبائل[1]

---

[1] ان قبائل کے لیے ملاحظہ ہو گزیٹیر ضلع گوجرانوالہ ص ۵۹ تا ۶۱

Marfat.com

سیالکوٹ میں ان کے مُرید قبائل میں سے نمایاں یہ ہیں۔
باجوے، بسرا، چیمے، گھمن، کاہلوں، گرہاتے، ساہی، سندھو[1]
خاص ضلع ساہیوال میں بہت کم تبلیغی کام شیخ داؤدؒ کے حصے میں آیا کیونکہ ان کے عہد سے قبل بہت سے درویش و اولیا کی کوششوں نے قبائل کے قبائل کو دائرۂ اسلام میں داخل کر لیا تھا۔ تاہم حضرت بابا فرید گنج شکر اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریا کی مساعی جمیلہ کے باوصف جو قبائل دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے رہ گئے تھے اور جن کو مسلمان کرنے کا شیخ داؤد دعویٰ کرتے ہیں وہ قبائل یہ ہیں۔
ارائن، بان، جھیانے، کولاہ کے جھیانے، مردانے بلوچ اور کئی دیگر قبائل جن کے اسما میرے ذہن سے اتر گئے ہیں[2]
پنجاب کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ایسے قبائل کی کوئی فہرست بنانا خاصا دقت طلب کام ہے۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ شیخ داؤد کے مرید اور معتقد پنجاب کے ہر ضلع اور ہر دیسی ریاست میں موجود ہیں، ہاں جنوب مغربی پنجاب میں ان کے مریدوں کی تعداد کم ہے جس کی وجہ اوپر بیان کر دی گئی ہے۔ جنوب مغربی پنجاب بابر کی آمد سے بہت پہلے دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ کیونکہ مبلغین صوبے کے اسی حصے میں سب سے پہلے داخل ہوئے۔ مقامی کوائف کے پیش نظر یہ میری ذاتی رائے ہے۔
شیخ داؤدؒ کے بہت سے مریدوں کو بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ مگر حضرت شاہ ابوالمعالی جو ان کے بھتیجے تھے بہت بڑے صوفی بھی تھے عالم بھی تھے اور شاعر

---

[1] ان قبائل کے لیے ملاحظہ ہو گزیٹیئر ضلع سیالکوٹ ص ۴۹ تا ۵۰۔ [2] ملاحظہ ہو گزیٹیئر ضلع منٹگمری ص ۶۲ تا ۶۷

Marfat.com

بھی۔ جہانگیر کا شاعر دربار طالب آملی حضرت شاہ ابوالمعالی کا مُرید تھا۔ اس کا ایک قصیدہ جو شاہ صاحب موصوف کی مدح میں ہے شعرالعجم میں مندرج ہے[1]۔

شیخ کے ایک اور مرید حضرت ابواسحاق مزنگ تھے۔ وہ اپنے دَور کے معروف صُوفی تھے اور ابوالفضل نے آئین اکبری میں ان کا نام نامی فہرستِ اولیا میں گنوایا ہے[2]۔

ہندوستان بھر میں سے ان کے دو مشہور مریدوں کے نام اُوپر دیے گئے ہیں۔ معاصر تواریخ و سوانح میں بھی ان کا ذکر موجُود ہے۔ لیکن وہ اصحاب جن کا تاریخ میں کوئی ذکر نہیں حالانکہ اپنی ذات میں وہ عظیم تھے۔ ان کے نام سرسری طور پر یہاں گنوائے دیتا ہُوں۔ سید زین العابدین مشہدی، سید شہاب الدین بخاری شیخ عبدالوہاب اور شیخ کمال۔ ایک روایت کے مطابق شیخ داؤدؒ کے تین سو ساٹھ خلیفہ اسی انداز کے تھے جس انداز کے وہ خُود اپنے مُرشد سیّد حامد گیلانی اُوشی کے خلیفہ تھے۔

شیخ داؤدؒ کے کردار کی تصویر پیش کرنے کے لیے بدایونی کے یہ الفاظ کافی ہیں:

"مختصر یہ کہ شیخ محورِ زمانہ تھے اور معجزانہ قوّتیں ان کے تصرّف میں تھیں۔ ابتدا ہی سے انھوں نے اپنی زندگی مطالعے، تحصیل علم، ریاضت اور عبادت کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ تارک الدّنیا اور قانع درویش تھے۔ اور شاہی درباروں میں کبھی نہیں گئے ماسوا ایک دفعہ کے جب سلیم شاہ سُوری نے انھیں گوالیار میں خصوصی طور پر بلا بھیجا تھا۔ اکبر جب پاک پتن کی طرف آرہا تھا تو شہباز کمبوہ کے ذریعے شیخ

[1] شعرالعجم ۳ ص ۱۵۱ - [2] آئین اکبری ۲ ص ۱۶۶

Marfat.com

داؤد کو ملاقات کی خاطر بلوایا۔ مگر انھوں نے یہ کہ کر معذرت کرلی کہ میں بادشاہ کی عدم موجودگی میں بھی اس کے لیے دعا کرتا رہتا ہوں اور اس کے لیے یہی کافی ہے۔ وہ امیر لوگوں سے دُور رہتے تھے اور فقر کو افتخار جانتے تھے۔ نفس کشی خود ان کا اپنا شیوہ بھی تھا اور اسی کی وہ دوسروں کو بھی تعلیم دیتے تھے۔

جب وہ اپنے مرشد کا سالانہ عرس کراتے تو کم و بیش ایک لاکھ آدمی ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوتے۔ اُن سب کی خوراک آپ ہی کے ذِمّے ہوتی تھی۔ پاکپتن اور ملتان میں سلسلہ چشتیہ اور سلسلہ سہروردیہ کی دو بڑی گدّیوں کے درمیان، سلسلۂ قادریہ کی ایک گدّی کے لیے شیر گڑھ کا انتخاب گویا مشیّت ایزدی کا اشارہ تھا۔ شیر گڑھ جھنّی (جسے آج کل چونیاں کہتے ہیں) کے نواح میں ایک نیا گاؤں تھا انھوں نے اپنا کام اس احسن طریق سے سرانجام دیا کہ ان کے نام کا چرچا اس روز تک رہے گا جس روز اسرافیل اپنا صور پھونکے گا اور قیامت برپا ہوگی۔" ان کی وفات ۹۸۲ھ بمطابق ۱۵۷۵ء میں ہوئی۔

غالباً بدایونی شیخ داؤد کی وفات سے کوئی دو سال قبل ان کا مرید ہوا تھا۔ اس نے شیخ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی قلم بند کیا تھا جس کا مفہوم یہ ہے۔

آپ کا خمیر آب و گل (کی آلائشوں) سے آزاد ہے آپ کا وجود رسا تمتاب کے وجود کی طرح عالمین کے لیے سراپا رحمت ہے آپ کا ذوالقدر نام داؤدؑ ہے۔ آدمی اور جن و پری اسی طرح آپ کے زیرِ نگین ہیں جس طرح حضرت سلیمانؑ کے زیرِ نگین تھے۔ "وجہ اللہ" کا مفہوم میری سمجھ میں سالہا سال نہ آیا، مگر جب آپ کا چہرہ دیکھا تو حقیقت کی مردم چشم روشن ہوگئی۔[۲]

Marfat.com

ساتواں باب

تحریکِ مہدویت

اس تحریک میں شیخ داؤدؒ اور شیخ بہلولؒ کا کردار

دربار میں شیخ داؤدؒ کی طلبی

ہندوستان میں تحریک مہدویت کا آغاز میر سید محمدؒ جونپوری کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ وہ صاحبِ علم بھی تھے اور نیک سیرت بھی۔ انھوں نے اوائلِ عمر ہی میں جملہ علوم متداولہ کا مطالعہ کر لیا تھا۔ ان کی ذات میں زہد و تقویٰ کا جوہر بھی تھا اور علم و فضل کی گیرائی اور گہرائی بھی۔ اسی سبب سے اس دور کے تقریباً سارے صاحب اثر لوگ اُن کے گرد جمع ہونے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو ان کی ذات میں اپنا رقیب نظر آنے لگا اور اس نے انھیں ملک بدر کر دیا۔ ہوا یوں کہ معاصر علما نے بادشاہ کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ میر سید محمد کے نظریات اور عقائد مبتدعانہ ہیں، نیز ان کے پیروؤں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ بادشاہ کے لیے ایک مستقل سیاسی خطرے کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہ نے انھیں وطن سے نکال دیا۔ میر سید محمد گجرات میں جا پہنچے جہاں کا بادشاہ سلطان محمود ان کا مرید ہو گیا۔ انھوں نے اپنے اردگرد مریدوں کا ایک ایسا حلقہ قائم کر لیا تھا جنھوں نے دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کر لیا

Marfat.com

تھا اور جنھوں نے لوگوں کو رشد و ہدایت اور تبلیغ دین کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا رُخ اس دَور کی دینی پیشوائیت کے اقتدار و اختیار کے خلاف تھا۔ مگر آخر کار یہ دینی پیشوائیت سید محمد کو ہندوستان (برعظیم پاک و ہند) سے نکلوا دینے میں کامیاب ہو گئی۔ چنانچہ وہ عرب و ایران میں گھومتے پھرے۔ آخر جب ہندوستان واپس آرہے تھے تو فرح کے مقام پر ۹۱۱ھ میں ملک عدم کو سدھار گئے۔ وہ مہدیِ موعود ہونے کے مدعی تھے ان کی وفات کے بعد ان کی تحریک کو ان کے مریدوں نے جاری رکھا اور بدستور ان کے "مبتدعانہ" نظریات کی تبلیغ کرتے رہے۔

حق یہ ہے کہ میر سید محمد کے معتقدین کسی جرم کے مرتکب نہ ہوئے تھے اور نہ ہی انھوں نے کوئی مبتدعانہ نظریات کی تبلیغ کی تھی۔ ان کا جرم فقط یہ تھا کہ وہ اپنے ہادی و مُرشد کا احترام کرتے تھے اور ہمعصر دینی پیشواؤں کی مذمت کرتے تھے کہ وہ اخلاقی بے راہ روی کا شکار تھے اور اپنے دینی اقتدار کا ناجائز فائدہ اٹھا کر خوب خوب مال اکٹھا کرتے تھے۔ واضح ہو کہ خود میر سید محمد لودھیوں کے اور ان کے مرید سُوریوں کے معاصر تھے۔

میر سید محمد کے مریدوں اور مذہبی اقتدار اعلیٰ کے مابین تصادم ناگزیر تھا اور سلطان پور کے مُلّا عبداللہ نے ان دو آدمیوں کو مبتدعانہ نظریات رکھنے کی پاداش میں ملک کے لیے خطرناک قرار دیدیا تھا۔ مُلّا عبداللہ ہندوستان (برعظیم پاک و ہند) کے دینی اُمور کا پیشوائے اعلیٰ تھا اور ملک میں اتنا با اثر تھا کہ بادشاہ بھی اس کی بات رد نہ کر سکتا تھا۔ تاہم بادشاہ اس پر رضامند نہ تھا کہ میر سید محمد کے مریدوں کے خلاف قتل کا انتہائی شدید اقدام کرے۔ مگر ملا عبداللہ بھی ایک خود پسند اور خود کام شخص

Marfat.com

تھا اور ہر اس آدمی کا سر کچل دینا چاہتا تھا جو اس کے سامنے سر اُٹھاتے۔ اسے شیر شاہ سلیم شاہ اور اکبر کے دربار میں مخدوم الملک کا خطاب حاصل رہا تھا۔ اور اس نے شیخ مبارک، شیخ عبداللہ نیازی اور شیخ علائی کو اپنے جور و ستم کا نشانہ بنائے رکھا تھا۔

شیخ علائی کو سلیم شاہ سُوری کے دربار میں طلب کیا گیا۔ جہاں ایک مناظرہ عمل میں آیا۔ شیخ علائی نے اپنے دلائل سے بادشاہ کو اس طرح متأثر کیا کہ اس نے شیخ علائی کو ملّا کی خواہش کے علی الرغم سزا دینے سے انکار کر دیا۔ مناظرے میں شیخ علائی نے مُلّا کو خوب خُوب رُسوا اُسے عیش و عشرت کا پرستار اور مال و منال کا حریص قرار دیا۔ شیخ علائی کو قتل تو نہ کیا گیا البتہ انھیں دکن کی طرف نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ لیکن مُلّا عبداللہ بھی شیخ علائی سے انتقام لے کر ہی رہا۔ وہ اس طرح کہ اس نے شیخ علائی پر الزام لگایا کہ وہ مہدی کے مقلد ہیں اور مبتدعانہ نظریات کے حامل ہیں۔ چنانچہ بادشاہ سے ان کے قتل کے حکم نامے کی توثیق کرالی۔ پھر انھیں کوڑے مار مار کر ہلاک کرا دیا گیا۔ دُوسرے بزرگ جو مُلّا عبداللہ کے غضب کا نشانہ بنے شیخ عبداللہ نیازی تھے جن کو مُلّا عبداللہ کے ایما اور سلیم شاہ سُوری کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ وہ بیانہ کے مقام پر قتل ہوئے۔ ان دونوں پر جو الزام لگائے گئے تھے وہ یہ تھے کہ وہ مبتدعانہ خیالات رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی انھیں عوام میں بے حد اثر و رسُوخ حاصل ہے۔ پھر یہ کہ شاہی لشکر کے اور دربار کے منصبدار بھی ان کی جانب میلان رکھتے ہیں گویا وہ مبتدعانہ نظریات کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ حکومت کے لیے بھی ایک خطرہ تھے[1]

شیخ بہلول کو جو شیخ داؤد جھنی وال کے مرید تھے، ان دونوں مقتولوں سے بڑی

---

[1] بدایونی ص ۳۱۱

Marfat.com

ہمدردی تھی انھوں نے ایک کتاب میں ملا عبداللہ کی زیادتی پر احتجاج کیا۔ یہ کتاب مہدویوں کے پاکیزہ سوانح پر مشتمل تھی۔ شیخ داؤد نے اس کتاب کو بہت پسند کیا تھا کیونکہ اس معاملے میں خود ان کی اور شیخ بہلول کی رائے ایک ہی تھی۔ دونوں نے ہی شیخ الاسلام ہند (برعظیم پاک و ہند) کے خلاف ہم زبان ہو کر احتجاج کیا۔ دونوں نے سید محمد کے دعوئِ مہدویت کی تو مذمت کی، لیکن ان کے ایک متقی درویش ہونے اور ایک مسلّم مجلسی رہنما ہونے کی تائید کی۔[1]

اتنی سی بات پر ملا عبداللہ کا مزاج برہم ہو گیا۔ چنانچہ شیخ داؤد جھنی وال کو دیپالپور کے ناظمِ اعلیٰ کے ذریعے سلیم شاہ سُوری کے دربار میں چند الزامات کی جوابدہی کے لیے طلب کر لیا گیا۔ اس وقت شیخ داؤد شیر گڑھ میں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ جب انھیں دیپالپور کے ناظم اعلیٰ کے ذریعے گوالیار میں حاضر ہونے کا حکم ہُوا بادشاہ ان دنوں گوالیار میں تھا۔ یہ سفر انھوں نے ایک یا دو خادموں کے ہمراہ تقریباً چالیس روز میں طے کیا۔ شیخ داؤد گوالیار پہنچے تو ان کو مُلّا عبداللہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُنھوں نے مُلّا عبداللہ سے بُلائے جانے کا سبب دریافت کیا تو مُلّا نے کہا مجھے پتا چلا ہے کہ تم نے اپنے مریدوں کو حکم دے رکھا ہے کہ اوراد و وظائف کے دوران میں بار بار تمھارا نام لیں۔ یہ امر اسلامی عقائد کے منافی اور شرک کا شاخسانہ ہے۔

شیخ نے جواب دیا کہ آپ تک صحیح اطلاع نہیں پہنچی۔ میں نے ہمیشہ اپنے مریدوں کو نماز میں فقط خدا ہی کا نام لینے کی ہدایت کی ہے۔ شیخ داؤد کو الزامات سے ان الفاظ کے ساتھ بری کر دیا گیا کہ اس منہ سے جھوٹ نہیں نکل سکتا۔

---

[1] تذکرہ - ابوالکلام آزاد ص ۱۰، ۸، ۳

Marfat.com

اس طرح شیخ داؤدؒ یقینی موت سے معجزانہ طور پر بچ گئے۔ اور ایک طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد واپس شیر گڑھ پہنچ گئے۔ بدایونی نے اس واقعے کو بالوضاحت نہیں لکھا بہرحال جو الزامات ان پر لگائے گئے تھے وہ چھپورے سے دکھائی دیتے ہیں[1]۔ اس سے یہ فیصلہ کرنا قرین قیاس ہے کہ شیخ کا بھی وہی حشر ہونے والا تھا جو شیخ علائی اور شیخ نیازی کا ہو چکا تھا۔ لیکن ملا عبداللہ کی تیغِ انتقام شیخ داؤد کے مؤثر انداز اور حاضر جوابی کے باعث کند ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ داؤد پر یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ وہ مہدی کے متبعین میں سے ہیں حالانکہ وہ نہیں تھے مگر یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے مہدی کی مدافعت کی تھی اس لیے کہ مہدی ایک متقی اور متورع شخصیت تھے شیخ نے انھیں ولی بھی قرار دیا تھا۔ اور ملا عبداللہ کی اس لیے مذمت کی کہ وہ تنگ نظر اور خونخوار شخص تھا۔ انھیں باتوں نے ملا کو جوش دلایا کہ وہ ایسے شخص کو دربار میں پکڑ بلوائیں۔ ملا عبداللہ نے شیخ داؤد کو اس لیے بھی منتخب کیا تھا کہ ان کا مذہبی رسوخ اور اثر بہت زیادہ تھا۔ بہت سے لوگ ان کے پیرو تھے اور یہ بات اسے گوارا نہ تھی۔ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ملا عبداللہ کو اس کے گھناؤنے ارادۂ قتل کے عملی نفاذ سے کس شے نے روکا کیونکہ ملا ٹلنے والا شخص نہیں تھا۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ شیخ داؤد خوش قسمت تھے جو ملا کی نیتِ بد کی زد سے بچ نکلے۔

---

[1] الاخبار الاخیار ص ۲۰۷

Marfat.com

آٹھواں باب

شیخ داؤد اور بدایونی

کیا بدایونی شیخ داؤد کا مرید تھا؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے اس لیے کہ بدایونی ہی وہ واحد مستند آدمی ہے جس نے ہمیں شیخ داؤد سے بالتفصیل روشناس کرایا ہے اگر بدایونی نہ ہوتا تو شیخ کے حالات اتنی صحت اور درستی سے ضبطِ تحریر میں نہ آتے۔ بدایونی کا بیان غیر واضح نہیں البتہ اس کے بعض حصے تصدیق طلب ضرور ہیں۔

بدایونی کے خیالات سے اتفاق کچھ ترمیمات کے بعد ہی کرنا چاہیے کیونکہ اُن پر مؤرخ کے ذاتی رجحان اور ارادت کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ بدایونی شیخ کی زندگی میں بھی ان کے ہاں حاضر ہوا اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے مزار پر پہنچا۔

وہ قصیدہ جو اس نے شیخ داؤد کی مدح میں لکھا اور اس کا وہ انداز جس سے وہ ان کی تعریف کرتا ہے اور وہ خطابات جو اِن کے لیے دورانِ گفتگو استعمال کرتا ہے ایسے امور ہیں جو بلاخوفِ تردید ثابت کرتے ہیں کہ بدایونی ان کا مرید تھا۔

وہ شیخ کی زندگی میں شیر گڑھ آنے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ "اس

Marfat.com

کے تین دن بعد میں لاہور سے شیر گڑھ کی جانب روانہ ہو پڑا اور ان کی خدمت میں چار دن تک رہا۔ وہاں ایسی چیزیں دیکھنے اور سننے میں آئیں جن کا میں گمان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ یہاں اس آیت کے اسرار و رموز مجھ پر ہویدا ہوئے کہ "جب وہ اللہ کو یاد کرنے کی خواہش کرتے ہیں"۔

میں نے گزارش کی کہ مجھے ترکِ دنیا کی اور گدڑی پر جاروب کشی کی اجازت دی جائے لیکن شیخ اس پر رضامند نہ ہوئے اور کہا کہ اب تم ہندوستان چلے جاؤ۔ پس میں نے ایسی عجیب بے بسی اور مایوسی کے عالم میں اجازت لی جو کسی کے تجربے میں نہیں آسکتی اور پھر چل دیا۔ وقتِ رخصت میرے دل حزیں نے بے تحاشا آہ و بکا شروع کر دی۔ جب شیخ کو اس کا پتا چلا تو مجھے ایک دن مزید قیام کرنے کی اجازت دے دی۔ اگرچہ تین روز سے زیادہ کوئی بھی آدمی ٹھہرنے کا مجاز نہ تھا مجھے چوتھے روز بھی اپنے پاس رکھا اور ایسی باتیں بتائیں جن کی شیرینی اب تک دل میں موجود ہے۔ میں اس آستان سے گھر کو لوٹ رہا ہوں۔ لیکن یہ میرے دل کا انتخاب و اختیار نہیں اور میں یوں گریہ و زاری کر رہا ہوں کہ آپ سمجھیں گے مجھے کسی ملکِ غیر کا سفر کرنا پڑ گیا ہے۔

یہ اور دوسرے حوالے جو اس کتاب کے سابقہ ابواب کے متن میں دیے گئے ہیں اگر اس بات کی تصدیق نہ کریں تو ذیل کی عبارت سے ان کی ایسی تکمیل ہو جاتی ہے جس سے بلا شک تمام شبہات دُور ہو جاتے ہیں۔ ذیل کے حوالے میں جو اصطلاح مستعمل ہوئی ہے وہ اسی تعلّق (مریدی) پر دال ہے۔ بدایونی ۹۸۲ھ کے واقعات قلم بند کرتے ہوئے اس طرح لکھتا ہے: ۱۶ جمادی الثانی۔ اس سال

Marfat.com

حضور قطب الاقطاب، مخزن ہدایت، مامن ولایت، جانشین شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی غوث الاعظم، قطب اقدس، میاں شیخ داؤد جھنی وال اس جہانِ فانی سے باغِ بہشت کی طرف عازمِ سفر ہوئے۔ آہ شیخ داؤد ولی تاریخ وفات اور تکمیلِ نعمت یادگاری کلمات ہیں[1]

کیا شیخ داؤد سیّد تھے

سولھویں صدی کے شہرۂ آفاق "شیخ داؤد جھنی وال" کے نام کا سابقہ "شیخ" ان کے نام و نسب کے ضمن میں گمراہ کُن ہے حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ کا ان کے نام سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں۔ آج کل شیخ کا لفظ ایک خاص ذات یا جات کو ظاہر کرتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان سلاطین دہلی کے عہد اور دورِ مغلیہ میں یہ لفظ ممتاز علمی فضیلت کی علامت تھا۔ بعض اوقات یہ لفظ زہد و تقویٰ پر بھی دلالت کرتا تھا جو اہلِ اسلام کے متشددین کے یہاں پایا جاتا ہے۔ شیخ داؤد قوم کے سیّد تھے۔ لیکن علمی فضیلت کی بنا پر انھیں شیخ کا لقب حاصل ہوگیا تھا۔ ابوالفضل کے نام کے ساتھ بھی جو اکبر کا وزیر اور مشہور عالم تھا۔ شیخ کا لفظ آتا ہے جو اس نکتے کی وضاحت کے لیے یہی کافی ہے۔ ابوالفضل کو عام طور پر شیخ ابوالفضل کہا جاتا ہے۔ اس کا سبب فقط یہ ہے کہ وہ بہت بڑا عالم تھا اور بے نظیر قابلیت کا مالک تھا بعض لوگوں سے یہ غلطی سرزد ہوتی ہے کہ انھوں نے شیخ داؤد کو غیر سیّد جانا۔ کیونکہ ان کے نام سے پہلے شیخ کا گمراہ کُن لفظ آتا ہے۔ حالانکہ صحیح تو یہ تھا کہ سیّد کا کلمہ آتا۔

---

[1] بدایونی ۔ رینکنگ اور لوص ۲۰۰

Marfat.com

ہمارے یہاں دو مورّخ ہیں اور دونوں یکساں قابل اعتماد بھی اور مستند بھی ہیں۔ ایک ابوالفضل ہے جو اکبر کے عہد کا سرکاری مورّخ تھا، اور دُوسرا ایک ایسا شخص جس نے اولیاء کرام کی زندگی کے مُطالعے کو اپنا خصوصی مضمون بنالیا تھا۔ دونوں کا بیان اس قیاس سے مختلف ہے جس کے قبول کر لیے جانے کا امکان ہے۔ یہ تیسرا شخص عبدالقادر بدایونی ہے جس نے شیخ داؤد کے یہاں جاکر مستند حالات قلم بند کیے ہیں۔ منتخب التواریخ یوں رقمطراز ہے۔

"جھنّی (جدید چونیاں) ایک قصبہ ہے جو لاہور کا ایک پرگنہ ہے۔ ان کے (شیخ داؤد) برگزیدہ آباؤ اجداد جو ابتداء میں عرب سے نقل وطن کر کے آئے تھے سیت پور میں آباد ہو گئے جو ملتان کے نواح میں ہے[1]۔" اس سے بلاشبہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ سامی النسل تھے۔ اور برگزیدہ آباؤ اجداد کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اطلاع روضۃ النوادر کے مصنّف سلطانی کی شہادت میں شامل ہو کر ثابت کر دیتی ہے کہ شیخ داؤد سیّد تھے۔ داراشکوہ جو ایک کٹّر مسلمان ہونے پر ایک آزاد خیال فلسفی ہونے کو ترجیح دیتا تھا اپنی کتاب سفینۃ الاولیاء میں لکھتا ہے۔

"جھنّی لاہور سے ملحق ایک قصبہ ہے۔ شیخ کے برگزیدہ آباؤ اجداد عرب سے نقل وطن کر کے ہندوستان (برّعظیم پاک و ہند) آئے اور شیخ سیت پُور میں پیدا ہوئے اور ۹۸۲ھ میں فوت ہوئے۔ ان کا مزار شیر گڑھ میں ہے جو جھنّی کے قرب و جوار میں واقع ہے[2]۔"

---

[1] بدایونی ص ۲۸ ، [2] داراشکوہ سفینۃ الاولیاء۔ ص ۱۹۲

Marfat.com

میرے خیال میں داراشکوہ بدایونی کی نسبت کم معتبر ہے۔ لیکن اسی کتاب کے ایک اور حصے میں وہ شاہ ابوالمعالی کے متعلق جو روایات، نسبیات اور تاریخ کی روشنی میں شیخ داؤد کے بھتیجے تھے لکھتا ہے۔ وہ نجیب الطرفین سید تھے اعجاز و دبنوغ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، وہ شیخ داؤد جھنی وال کے مرید تھے جو سلسلۂ قادریہ کے درویش تھے۔ تیس سال کی محنت و ریاضتِ شاقہ کے بعد وہ لاہور کے شہر میں سکونت پذیر ہوئے۔ میرے قابلِ احترام استاد کا یہ کہنا ہے کہ ایک دن وہ اپنے استاد مُلّا نعمت اللہ کی معیت میں ان سے ملنے گئے۔ مُلّا نعمت اللہ ایک بہت بڑے عالم اور نیک شخص تھے جو جنّات کو وظیفے کے ذریعے قابو میں کر لیتے تھے[1] یہ سید ابوالمعالی جن کا ذکر داراشکوہ نے بڑے احترام سے کیا ہے، شیخ رحمت اللہ کے بیٹے تھے اور شیخ رحمت اللہ شیخ داؤد کے بڑے بھائی تھے۔ شیخ داؤد شیخ ابوالمعالی کے ساتھ تین تعلقات کی رُو سے وابستہ تھے، اوّل یہ کہ وہ اُن کے بھتیجے تھے، دوم یہ کہ وہ ان کے داماد تھے اور سوم یہ کہ وہ رُوحانی تعلیم میں ان کے شاگرد اور مرید تھے۔ ان نکات کی توثیق بدایونی کی سند سے ہوتی ہے، وہ یوں رقمطراز ہے۔ "وہ (سید داؤد) وہاں (سیت پور میں) پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد ان کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے چل بسے تھے۔ ان کی والدہ ماجدہ ان کی پیدائش کے تھوڑی مدت بعد راہیِ ملکِ عدم ہوگئیں۔ چونکہ وہ یتیم رہ گئے تھے اس لیے شیخ رحمت اللہ نے کہ وہ شیخ داؤد کے بڑے بھائی تھے اُنھیں نے پالا پوسا۔" اسی کتاب کے کسی دُوسرے حصے میں وہ اس طرح کے تمام شکوک و شبہات کو ذیل کے الفاظ میں رد کر دیتا ہے۔ ان الفاظ کا موضوع زیرِ بحث سے گہرا تعلق ہے۔ وہ لکھتا ہے

Marfat.com

"وہ (ابوالمعالی) شیخ داؤد محافظ تعلیم رُوحانی قطب الاقطاب سجّادہ نشین مسندِ توحید صاحبِ شمشیر خداوندی ماویٰ غربا، مظہر کمالِ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بھتیجے، داماد اور رُوحانی جانشین تھے۔[1]"

جس قدر مواد مجھے میسّر آسکا میں نے اس نکتے کی وضاحت میں کھپا دیا ہے کہ شیخ ایک خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ جو ایران میں خاصا مشہور تھا۔ سندات اُوپر پیش کی گئی ہیں اور ہر چیز ان کے سید ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ بدایونی کی شہادت سے عیاں ہے کہ وہ سامی النسل تھے اور یہ کہ ان کے آباؤ اجداد ملک عرب سے نقل وطن کر کے واردِ ہندوستان ہوتے تھے۔ بدایونی کی سند پر داراشکوہ کی تصدیق۔ شیخ داؤد کے بھتیجے کے متعلق ہے۔ یہ تمام دلائل بدایونی کی اتفاقیہ مگر گمراہ کُن اور قاری کو متاثر کرنے والی عبارت کو بے وزن بنا دیتے ہیں کہ شیخ سیّد نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے سامی النسل ہونے کے متعلق کبھی کسی نے شبہ نہیں کیا۔ جب بھی اس معاملے پر بحث و تمحیص ہوئی نسبیات نے انھیں ہمیشہ سیّد ثابت کیا۔ تاریخ بھی شیخ کی نسبیات کی تائید کرتی ہے۔ خواہش مند حضرات کے لیے شیخ داؤد کا شجرہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ سادات کے انساب پر کئی ایک کتابیں ہیں۔ شیخ کے شجرۂ نسب کے باب میں شجرۃ العالمین کی طرف رجُوع کیا جائے۔

سیّد داؤد کرمانی ۔ سیّد فتح اللہ ۔ سیّد مبارک ۔ سیّد فیض اللہ باقی
سیّد صفی الدین احمد ۔ سیّد نقی الدین احمد ۔ سید عبدالمجید ۔ سید عبدالحفیظ
سیّد عبدالرشید ۔ سید ابوتیم ۔ سید ابوالمکارم ۔ سید ابوالمحاسن ۔ سید ابوالفیض

[1] منتخب التواریخ بدایونی ص ۱۰۲

Marfat.com

سید ابوالفضل ۔ سید عبدالباری ۔ سید ابوالمعالی محمد ۔ سید ابوالواہب
سید ابوالحیات ۔ سید شاہ محمدیہ ۔ سید مسعود ۔ سید محمود ۔ سید ابوالاحمد
سید داؤد ۔ سید ابوابراہیم اسمٰعیل ۔ سید محمد عرج ۔ موسیٰ مبارقہ
امام محمد لقی ۔

Marfat.com

(ضمیمہ ۱ از محمد شفیع)

روضۂ مبارکۂ بندگی حضرت داؤد کرمانی شیر گڑھی رحمۃ اللہ علیہ

۷ دسمبر ۱۹۵۲ء کو اوکاڑے سے موٹر کے ذریعے شیر گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ لیفٹیننٹ احمد ربانی سلمہٗ اور مکرمی جناب سید علی رضا گردیزی صاحب جو ستلج کاٹن ملز اوکاڑہ میں لیبر مینجر ہیں، ہمراہ تھے۔ یہ دونوں نوجوان اپنے عہدوں کے مشاغل کے ساتھ ساتھ شوقِ علم اور ذوقِ سلیم کو جمع کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف اس سفر میں ہمراہ تھے بلکہ تمام انتظاماتِ سفر انھوں نے اپنے ذمے لیے تھے اور سہولت اور پابندی وقت سے یہ سفر طے ہوا۔ اوکاڑے سے دس میل کے فاصلہ پر ریناله اور وہاں سے تقریباً ۱۱ میل پر شیر گڑھ ہے۔

شیر گڑھ ایک مختصر سی بستی ہے۔ کہتے ہیں کہ شیر شاہ نے یہاں قلعہ بنایا تھا (گزیٹیر ضلع منٹگمری لاہور ۱۹۳۵ء، صفحہ ۱۳۳)۔ اس بستی میں اگرچہ متولی صاحبان کے بنگلے اور ان کے تعمیر کردہ مکانات جابجا نظر آتے ہیں، مگر یہاں کی سب سے اہم تاریخی عمارت جناب داؤد کرمانیؒ کی خانقاہ[1] ہے۔

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کے زمانے میں خانقاہ سے متعلق موقوفات تھے اور متعدد گاؤں بطور جاگیر متولیوں کو ملے ہوئے تھے مگر وہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے (ملاحظہ ہو ضلع منٹگمری کا گزیٹیر، لاہور ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۴۱)

Marfat.com

یہ خوبصورت ہشت پہلو گنبد دار عمارت ایک چبوترے پر بنی ہے۔ عمارت کے اندر چونے پر جابجا گل کاری کی گئی ہے۔ ہشت پہلو رقبے سے دیواریں اٹھا کر ان پر آٹھ محرابیں بنائی ہیں اور ان محرابوں پر گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ چار دیواری کی تمام درمیانی جگہ میں جناب کرمانیؒ کا گورخانہ ہے اور قبروں میں سب سے نمایاں قبر جناب کرمانیؒ کی ہے۔ مذکورہ محرابوں کے نیچے شمالی سمت سے شروع کر کے مسلسل چار طرف پوری سورۃ الفتح لکھی ہے۔ یعنی انّا فتحنا لک فتحاً مبیناً سے مغفرۃً و اجراً عظیماً تک۔ گنبد کے اندر روشنی کم ہے تاہم کچھ روشنی کرنے کے بعد سیڑھی لگا کر اس کتبے کو پڑھا گیا۔ نیچے دیواروں پر ذیل کی فارسی نظم جلی نستعلیق خط میں درج ہے۔ اس کا مطلع شمالی دیوار کے دائیں سرے پر ہے اور مقطع جنوبی دیوار کے بائیں سرے پر۔ یہ کل نو شعر ہیں۔

نظم

ای بمعنی چون پیمبر رحمۃً للعالمین

سرفرازِ صورت و معنی شہِ دنیا و دین

نکتۂ وحدت کہ کس را نیست حاصل بیگمان

طالبان را از رخ خوب تو شد عین الیقین

قطبِ عالم شیخ داؤدؒ آں سپہر معرفت

عالمِ علمِ مبین و شارعِ شرعِ متین

Marfat.com

خلعت قرب و کرامت راست بر بالای او
ہم شریعت ہم حقیقت دارد اندر آستین

بس کہ نور قادری ہر دم ز رُویش ظاہر است
پیش او ملک و ملک دارد بجان سر بر زمین

وہ نبی یا رحمۃ للعالمین[1] می خوانمش
خبرتی دارم ز وصفِ او نمی دانم جز این

چون نبی شد رحمۃ للعالمین، این گفتہ شد
[2] ... گلشن ... [2] نبی یا رحمۃ للعالمین

ای سپہر معرفت! دارد تمنا مسلمی
آنکہ باشد زندہ مردہ در غمِ عشقت قرین

حشر آں غم دیدہ ہم از خاکساران تو باد
ایں دعا را باد آمیں یارب! از روح الامین

گنبد کے اندر کھڑے ہو کر دروازے کی طرف رخ کریں تو جنوبی دیوار کے بائیں سرے پر یہ شعر لکھے ہوئے ملیں گے۔

ایں شاہ کہ از عشق بحق بود ثباتش
"یا عاشق مست" آمدہ تاریخ وفاتش

---

[1] بطریق تحسین یہ کلمہ استعمال ہوا ہے۔

[2] یہ الفاظ مٹ سے گئے ہیں۔

Marfat.com

اس مادّۂ تاریخ یعنی "یا عاشق مست" سے ۹۸۲ھ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ شعر ہیں جن سے اس تاریخ کی تصدیق مزید ہوتی ہے۔

تاریخ طلب کنند گر اہل جہاں
بر گوی معالی بسر شوق رواں
در نہصد ہشتاد و دو ایں شاہ جہاں
شد عند ملیکِ ملکِ خیمہ زناں

پہلی نظم میں تخلص مسلمیٰ اور آخری دو شعر میں معالی۔ یہ دونوں تخلص شاہ ابوالمعالی لاہوریؒ کے ہیں جن کا ذکر اس مضمون کے آخر میں آئے گا۔

یہ عمارت گنبدی کے اندر کی کیفیت تھی۔ باہر کی جانب دروازے کے اُوپر یہ آیتِ شریفہ لکھی ہے۔ اِنّ اللہَ وملٰئکتہ . . . الی . . . وَسَلِّمُوا تَسلیماً۔ عمارت کے گنبد پر نفیس گُل کاری کی گئی ہے اور اس پر پانچ سیاہ و سُرخ رنگین پٹیاں بنی ہیں تمام عمارت پر ڈھائی تین انچ موٹی چونے کی تہہ ہے اور اس کی سطح گل کار ہے مرورِ زمانہ سے اس گل کاری کا رنگ خراب ہوگیا ہے اس لیے اس کی تجدید ایک عرصے سے ہو رہی ہے۔ صَرف متولّی صاحبان کا ہے مگر محکمۂ آثارِ قدیمہ کی معرفت یہ صَرف اُٹھ رہا ہے۔ مستری احمد یار ساکن کوٹ عثمان خاں قصور نے مجھ کو بتایا کہ وہ بیس سال سے اس مقبرے کی مرمّت کر رہا ہے۔

لہ تحفۂ قادریہ جو جناب ابوالمعالی محمدؒ کی فارسی تصنیف ہے۔ اس کے ترجمۂ اردو طبع لاہور ۱۳۲۲ھ صفحہ ۲ پر ہے یہ غزل فقیر کی مسلمی تخلص کے نام سے ہے اس سے ظاہر ہے کہ جناب ابوالمعالیؒ کا تخلّص مسلمی بھی تھا۔

Marfat.com

پہلے اس کا بھائی اس کا ہم کار تھا۔ وہ فوت ہوگیا تو اب اس کا شاگرد اس کو مدد دے رہا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ محکمے آثار قدیمہ سے ایک صاحب بابو مسعود نامی اس کا کام ماہ بماہ دیکھنے کے لیے آتے ہیں اور اسی محکمہ سے اس کو مشاہرہ ملتا ہے دیواروں پر باہر کی طرف بلندی پر جابجا اس قسم کے جملے لکھے ہیں۔

جلّ قدر اللہ الودود

جلّ قدر اللہ ذی المقام المحمود

جلّ قدر اللہ المعبود

جلّ قدر اللہ ذی الشہود

حیّ احد

مستری احمد یار تجدید نقوش کا کام بہت ہوشیاری سے سرانجام دے رہا ہے مگر سوء اتفاق سے وہ ناخواندہ ہے۔ لکھے پڑھے لوگوں کو عبارتیں پڑھ کر اس کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ ورنہ لفظوں کے اجزاء کو غلط طور پر ملانے سے عبارتیں ہمیشہ کے لیے مسخ اور بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔

لہ ملاحظہ ہو:۔ اخبار الاخیار (طبع دہلی ۱۳۰۹ھ) صفحہ ۲۰۱ (معارج الولایت از عبداللہ خویشگی نسخہ کتابخانہ دانش گاہ پنجاب میں ورق ۲۳۴ پر ان کا حال دیا ہے جو تمام تر اخبار الاخیار پر مبنی ہے) اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار) طبع آگرہ ۱۳۲۶ صفحہ ۲۰۷، خزینۃ الاصفیاء از مفتی غلام سرور لاہور ۱۲۸۳ھ صفحہ ۱۲۰، حدیقۃ الاولیاء از مفتی مذکور کانپور ۱۹۰۶ء صفحہ ۱۰ نیز دیکھیے تذکرۂ مولانا ابوالکلام (کلکتہ ۱۹۱۹ء) صفحہ ۲۳ ببعد

Marfat.com

ابھی یہ سوال باقی ہیں کہ

صاحب روضہ کون سے بزرگ ہیں ؟

اور بانی عمارت کون ہیں ؟

صاحب روضہ حضرت شیخ المشائخ بندگی شاہ داؤد کرمانیؒ کے حالات یوں تو مغلیہ عہد کے اولیاء اللہ کے تذکروں میں عام طور پر ملتے ہیں مگر منتخب التواریخ (طبع کلکتہ) ۳: ۲۸ بعد پر بداؤنی نے آپ کے کچھ چشم دید حالات درج کیے ہیں وہ مفصل اور بہت ہی دلچسپ ہیں۔

ان کا حاصل یہ ہے کہ شیخ داؤدؒ کے آبائے کرام عرب سے آئے اور نواحی ملتان سیت پور[1] میں آباد ہوئے۔ آپ کے والد ماجد[2] آپ کی ولادت سے پہلے فوت ہو گئے اور آپ کی والدہ مکرمہ آپ کی ولادت سے تھوڑی مدت بعد فوت ہوئیں، شیخ رحمت اللہ آپ کے بڑے بھائی نے آپ کو پالا۔ گردش روزگار سے آپ پہلے سنگھرہ[3] اور وہاں سے لاہور آئے اور مولانا جامی کے شاگرد مولانا اسمٰعیل اچہ سے پڑھنا شروع کیا

---

[1] سیت پور ضلع مظفر گڑھ میں ہے ملاحظہ ہو

نقشہ نمبر ۲۴ - آئین اکبری (ترجمہ جیرٹ ۲: ۳۳۱ پر) میں افغانوں کی اس بستی کو علاقہ بیرون پنجند کا سب سے بڑا رقبہ قرار دیا۔

[2] ان کا نام فتح اللہ کرمانی تھا حدیقۃ الاولیاء صفحہ ۱۱)

[3] سنگھرہ شیر گڑھ سے چند میل شمال مغرب کی طرف ضلع منٹگمری ہی میں واقع ہے۔ گوگیرہ سے یہ مقام ۱۳ میل مشرق کو ہے دیکھیے ضلع منٹگمری کا گزیٹیر صفحہ ۳۰ بعد۔

Marfat.com

بچپن ہی میں[1] شرح اصفہانی ایسی اچھی طرح سے پڑھتے تھے کہ ولایتی لوگ جو آپ کے ہم سبق تھے آپ کی جودت طبع اور صفائے ذہن سے محو حیرت ہوتے تھے۔ اور مولانا اسمٰعیل کہتے تھے کہ جس طرح ہم مولانا جامی کے دیدار پر فخر کرتے تھے اسی طرح عنقریب یہ جوان ایسا مرتبہ پائے گا کہ لوگ تیمن و تبرک کی خاطر اس کا دیدار کریں گے اور اس کے انفاس شریفہ سے فائدہ اٹھائیں گے اور فیض پائیں گے اور اسی طرح ہوا اور آپ نے علامہ کا مرتبہ پایا۔

جب آپ ریاضات شاقہ[2] میں مشغول تھے جاذبہ الٰہی کے ایک جذبے نے آپ کو آلیا

---

[1] بظاہر ابوالثناء (محمود بن عبدالرحمٰن) الاصفہانی الشافعی (م۔ ۷۴۹ھ) کی مطالع الانظار شرح طوالع الانوار مراد ہے طوالع انوار (فی التوحید) قاضی بیضاوی کی تصنیف ہے۔

[2] اخبار الاخیار ۲۰۶ پر ہے: و ابتدائے حالت جذبہ و درآمدن او در طریق سلوک آنچناں بود کہ او را در اثنائے تحصیل علوم قائد توفیق الٰہی بجانب دیگر برد و بطریق ریاضت و مجاہدہ دلالت کرد و چندان کار بر نفس تنگ گرفت و برخلاف مراد او رفت کہ از حد تقریر و تحریر خارج باشد۔ گاہی از اول شب تا آخر بقیام گزرانیدی بی آنکہ بہ رکوع رود و گاہی تمام شب در رکوع بودی و گاہی در سجود و گاہی در قعدہ ہم برین نہج آنچہ از عبادات اشق و اخص (کذا در دو نسخہ مطبوعہ صوابش احمز) بودی اختیار و التزام نمودی چند سال در بیابان بدیں طریق گذرانید تا خاطر خطیرش از جمیع وساوس و تعلقات آسودہ شدہ و تفرقہ و تشویش از باطن فیض مواطنش رخت بربست آنگاہ از برای اقامت سنت انابت و بیعت کہ طریقہ مسلوک مشائخ طریقت است متوجہ جناب اقدس (یعنی شیخ حامد گیلانی ؒ) شد۔ اس عبارت میں اخص کے بجائے احمز پڑھنا چاہیے یعنی استوار تر اور قوی تر فی حدیث ابن عباس ؓ سئل رسول اللہ ای الاعمال افضل فقال احمزہا علیک یعنی امتنہا و اقواہا و اشدہا و قیل امضہا و اشقہا (لسان العرب ۷ : ۲۰۵)

Marfat.com

اور روحانیت حضرت غوث الثقلینؓ آپ کی مددگار اور محافظ بنی تا آنکہ آپ اپنے سوالوں کا جواب سننے لگے اور محبوبان مجذوب اور مجذوبانِ محبوب کی طرح آپ کو بارگاہ ولایت و ہدایت و تکمیل و قرب تک تک کشاں کشاں لے جایا گیا۔ جذبے کے زمانے میں آپ نواح دیپال پور کے صحرا میں جہاں اب شیر گڑھ ہے، اور اس زمانے میں درندوں اور وحوش و طیور کا مسکن تھا، گھوما کرتے تھے۔ وہ گاہے گاہے پاک پتن میں حضرت گنج بخش شکرؒ کے مزار متبرک کے طواف کے لیے جاتے تو اشارے پاتے اور بشارتیں سنتے اور باتیں ہوتیں جن کی تفصیل آپ کے بھتیجے شیخ ابوالمعالی[1] بن شیخ رحمت اللہ نے اپنی کتاب "نغمات داؤدی"[2] میں دی ہے۔ غرض کم و بیش بیس برس انھوں نے جذبے اور دشت و صحرا کی سیر میں گزارے۔ اس کے بعد انکے دل میں ڈالا گیا کہ سیر و سلوک اور ارشاد و خلائق کی طرف رجوع کریں۔ چونکہ ظاہری پیر و مرشد ان کا نہ تھا وہ سوچ میں پڑے رہے تا آنکہ روحانیت حضرت غوث الاعظمؓ نے ان کو تلقین کی اور حکم دیا کہ وہ دست انابت شیخ حامد قادریؒ[3] کے ہاتھ میں دیں تاکہ سلسلے کی نگہداشت

---

[1] شیخ کی تاریخ ولادت ۱۰ ذی الحجہ ۹۶۰ھ ہے۔ بداؤنی نے ان کی ولادت کا مادۂ تاریخ "گدای شیخ داؤد" اور "ابوالمعالی حق پرست" دیا ہے۔ یہ بائیس برس کے تھے کہ شیخ داؤدؒ کا انتقال ہوا ۹۶۰ھ

[2] اس کتاب کے کسی نسخہ کا وجود مجھکو معلوم نہیں برٹش میوزیم انڈیا آفس، کرزن کلکشن کلکتہ کی فہرستوں میں اس کا کوئی نسخہ درج نہیں ہوا۔

[3] رک بہ اخبار الاخیار صفحہ ۲۰۰، حدیقۃ الاولیا از غلام سرور لاہوری طبع کانپور ۱۹۰۶ء صفحہ ۱۰ پر ہے کہ سید حامد گنج بخش بن سید عبدالرزاق بن سید عبدالقادر ثانیؒ خاندان قادریہ اعظمیہ میں سے بڑے

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے

Marfat.com

مدنظر رہے۔ شیخ حامد متامل ہوئے تو یہ خود قصبۂ سنگھرہ میں جہاں وہ اس وقت مقیم تھے پہنچے اور جذبے کے غلبے سے کہا۔ یہ دیکھیے غوث الاعظم موجود ہیں اور اشارہ فرما رہے ہیں کہ سجادہ، عصا اور شجرہ، خلافت اور گھوڑا اور پالکی اور مشیخیت اور مقتدائی کے باقی لوازم میرے حوالہ کریں۔ مخدوم حامد نے سب ودائع الٰہی ان کے سپرد کیے اور انھوں نے چوہنی[1] کے نزدیک ملتان اور پاک پتن کے درمیان شیر گڑھ کی نئی بستی میں اقامت اختیار کی اور سلسلۂ سہروردیہ چشتیہ اور قادریہ کو رواج دیا

مُلّا عبداللہ سلطان پوری[2] الملقب بہ مخدوم الملک اس زمانے میں بہت زوروں پر تھے۔ اسلام شاہ سُوری (۹۵۲ تا ۹۶۰) کا عہد تھا گوالیار سے جناب

(باقی صفحہ ۹۶ پر دیکھیں)

بزرگ صاحب شریعت و طریقت و حقیقت و معرفت تھے اُچ میں سکونت رکھتے تھے۔ سید شیر شاہ ملتانی اور شیخ داؤد کرمانی حضرت کے کاملین خلفا میں سے تھے۔ آپ کی وفات ۹۷۸ھ میں ہوئی اور وہ اُچ میں مدفون ہیں۔

[1] بدایونی نے آپ کو چھنّی والؒ لکھا ہے۔ خزینۃ الاصفیاء صفحہ ۱۲۱ پر سفینۃ الاولیاء کے حوالے سے لکھا ہے کہ اول والد بزرگوار سید داؤد، سید فتح اللہ از عرب بہ ہندوستان تشریف آوردہ بمقام ہیبت پور (والصواب: سیت پور) سکونت ورزید، بعد ازاں در قصبۂ چونی کہ بفاصلۂ چہل کروہ از لاہور بہ جنوب واقع است توطن پذیرفت و تولد شیخ داؤد بعد از وفات پدر عالی قدر بچند ماہ بوقوع آمد چوں بسن بلوغ رسید پیش مولانا اسماعیل کسب علوم ظاہری نمود، من بعد جاذب حقیقی او را بخود جذب کرد الخ۔ قصبۂ چونی کو آجکل چونیاں کہتے ہیں۔

[2] معارج الولایۃ (نسخۂ کتاب خانۂ دانشگاہ پنجاب) ورق ۲ ب پر لکھا ہے کہ مخدوم الملک عبداللہ

باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

Marfat.com

بن شمس الدین انصاری نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں مثلاً عصمۃ الانبیاء، کشف الغمہ، منہاج الدین وغیرہا۔ صاحب معارج نے منہاج الدین سے چند صفحے نقل کیے ہیں اِسمیں یہ عبارتیں بھی ہیں:

وقد بما احب احیاء مراسم الدین وصفت (سعیت؟) دائما بشوق اماطۃ البدعۃ عن مشارع ملۃ سید المرسلین ونشأت فی بلاد لم تکن اہل القبلۃ فیہا منتحل الملک (الملل) والنحل الباطلۃ فاہلہا اما مسلم سنی حنفی او کافر مشرک ذمی کما قال العارف الملقب بترک الالٰہی امیر خسرو الدہلوی فی وصف تلک البلاد واہلہا۔

خوشا ہندوستان ورونق دیں — شریعت را کمال عز و تمکین
ز علم باعمل، دہلی بخارا — ز شاہان گشتہ اسلام آشکارا
تمامی کشور از تیغ غزا کار — چو خارستان ز آتش گشتہ بی خار
زمینش سیر خوردہ آب شمشیر — فروخفتہ غبار کفر در زیر
ز بردستان ہند گشتہ پامال — فرو دستان ہمہ در دادن مال
بجایی کآب جستہ کدخدایان — ز مغز خویش روغن دادہ رایان
بدین عزت شدہ اسلام منصور — بدان خواری سران کفر مقہور
بذمہ گر نبودی رخصت شرع — نماندی نام ہندو ز اصل تا فرع
سر ہندو چو فرمان را مطیع است — ز آب تیغ خونش را شفیع است
ز غزنین تا لب دریا درین باب — ہمہ اسلام بینی بر یکی آب
نہ زان زہ دیدہ زاغان گرہ گیر — ہمہ در کیش احمد راست چون تیر
نہ ترسائی کہ از نا ترسگاری — نہد بر بندہ داغ کردگاری
نہ از جنس جہودان جنگ و جوریت — کہ از قرآن کند دعویٰ بہ توریت

Marfat.com

نہ مغ کز طاعت آتش شود شاد　　وزو با صد زباں آتش بفریاد
مسلمانان نعمانی روش خاص　　ز دل ہر چار آئین را باخلاص
نہ کین با شافعی نے مہر بازید　　جماعت را و سنت را بجان صید
نہ زاہل اعتزالی کز فن شوم　　ز دیدار خدا کردند محروم
نہ رفضی تا رسد زان مذہب بد　　جفائے بر وفاداران احمد
نہ آں سگ خارجی کز کینہ سازی　　کند با شیر حق روباہ بازی
زہی خاک مسلمان خیز دین جوی　　کہ ماہی نیز سنی خیزد از جوی

(رک بہ دولرانی خضر خاں　　علی گڑھ ۱۹۱۷ء صفحہ ۴۶) نعم قد کان فی بعض الاحیاء (الاحیان) یجئ فیہا من بعض البلدان اشخاص من اہل البطلان کالزنادقۃ والرفقۃ (الرافضۃ) والقرامطۃ والملاحدۃ والمہدویۃ لکن اللہ تعالیٰ کان یکفی شر ہولاء الاشرار ویسلط علیہم من علماء الدین وحکامہ من یبیرہم اور یسیطرہم (یطردہم) من ہذہ الدیار، ومما من اللہ سبحانہ وتعالیٰ علی ہذا الضعیف انہ وقفہ واعانہ علی قمع ہذہ الطوائف اسوۃ . . . الربانیین البالغین فی الجہاد مع اہل الفساد فجاہدت . . . الضالین (الضالین) المضلین واثقاً . . . ان ینصرکم اللہ (فلا غالب لکم ۔ قرآن مجید ۳ : ۱۵۴) بمحض تائید اللہ سبحانہ وتسدیدہ فالحمد للہ علی نعماء (ہ) کلہا (آخری تین سطروں کی بعض عبارتیں جلد ساز نے جلد بندی اور مرمت کے وقت کاٹ دی ہیں) ڈاکٹر زبید احمد نے اپنی کتاب The Contributions of India to Arabic Literature طبع الہ آباد ۱۹۴۶ء صفحہ ۲۷۳ و ۳۲۲ اور ۴۰۳ پر مخدوم الملک کی بعض تصانیف کا حال دیا ہے مگر منہاج الدین کا ذکر انھوں نے نہیں کیا البتہ شرح جامی کا اضافہ اُوپر کی فہرست میں کیا ہے عصمۃ الانبیاء کا نسخہ بانکی پور میں ہے (یعنی بجائی کہ کدخدایان یعنی والیان ملک آب جستند الخ ۔)

Marfat.com

شیخ داؤد کی طلبی ہوتی یہ گئے اور گوالیار سے باہر ملا عبداللہ اور ان کی ملاقات ہوتی آپ نے پوچھا کہ فقرائے منقطع کی طلبی کس تقریب سے ہوتی ہے؟ مخدوم الملک نے کہا۔ سنا ہے کہ آپ کے مرید ذکر کے وقت یا داؤد یا داؤد کہتے ہیں۔ شیخ نے فرمایا۔ شاید سامع کو سننے میں اشتباہ ہوا ہو۔ اس جماعت نے ظاہراً یا ودود یا ودود کہا ہو۔ غرض اس تقریب سے ایک دن یا ایک رات مخدوم الملک کے پاس رہے ان کو مواعظ نصائح بلند اور معارف وحقائق ارجمند کے چند کلمے کہے مخدوم الملک متاثر ہوئے اور وہیں سے ان کو عزت کے ساتھ واپس کیا۔

بداؤنی نے جناب داؤد کے بذل وایثار کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ سال میں ایک دو مرتبہ ہر نقد وجنس جو فتوحات سے حاصل ہوتا تھا لٹا دیا کرتے اور اپنی اہلیہ سمیت اپنی رہائش کے حجرے میں چلے جاتے تھے اور سوا مٹی کے لوٹے اور بوریائے کہنہ کے کوئی چیز اپنے لیے نہ رکھتے تھے۔ دوبارہ جب خزانے کو بھرا ہوا پاتے تو یہی طریقہ اختیار کرتے تھے اس کے علاوہ ایام میلاد وعرس حضرت غوث اعظمؒ میں تمام زائرین کو جن کی تعداد لاکھ نفوس کے برابر ہوتی تھی کھانا وغیرہ خانقاہ کے لنگر سے ملتا تھا۔ نیز دیکھیے منتخب التواریخ صفحہ ۲: ۱۵۶) بداؤنی لکھتے ہیں کہ یہ تصرف آج بھی بحال ہے بلکہ پہلے سے کئی گنا زیادہ۔

بداؤنی بیرم خاں کے عہد حکومت میں (۹۶۳ھ تا ۱۰۰۷ھ) آگرہ میں طالبعلمی کر رہا تھا۔ کہ اس نے بعض درویشوں سے جناب داؤد کا حال سنا اور غائبانہ محبت اعتقاد اور اشتیاق دل میں پیدا کیا اور چند مرتبہ شیر گڑھ جانے کے ارادے سے روانہ ہوا مگر ہر بار موانع نے راستہ روکا۔ آخر بارہ برس کے بعد اس کے شیر گڑھ آنے کی تقریب

Marfat.com

پیدا ہوتی۔ وہ یوں کہ وہ حسین خاں[1] کی ملازمت میں تھا۔ خان مذکور کو ابراہیم حسین خاں مرزا[2] کے تعاقب کا حکم ملا۔ یہ مرزا سرنال سے بھاگ کر پنجاب آگیا تھا اور یہیں وہ ۹۸۰ھ میں گرفتار ہوا اور بالآخر ملتان میں بحالت قید زخموں کی شدت سے نڈھال ہو کر فوت ہوگیا۔ یہ واقعات شعبان اور ذی قعدہ ۹۸۰ء کے درمیان واقع ہوئے (منتخب التواریخ ۲: ۱۴۹ تا ۱۶۱، اکبر از ونسنٹ سمتھ ص ۱۱۱ و ۱۱۶ و ۴۵۱)

ابراہیم حسین خان مرزا کے تعاقب کے زمانے میں بداؤنی لاہور سے شیر گڑھ پہنچا اور چار دن آپ کی خدمت میں حاضر رہا۔ اس سلسلے میں اس نے دو تین نہایت دلچسپ باتیں قلم بند کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جناب شیخ نہایت صاحب جمال تھے، تبسم اور تکلم کے وقت آپ کے دانتوں سے جو نور چمکتا تھا وہ دل کو منور کرتا تھا۔ کم دن ہوں گے کہ جن میں کم و بیش سو سوا اور پچاس پچاس ہندو اپنے جنیو و تبار سمیت آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لاتے ہوں[3] اور تلقین نہ حاصل کرتے ہوں۔ بداؤنی نے شیر گڑھ کے در و دیوار اور شجر و حجر کو تسبیح و ذکر کے غلغلے سے پُر پایا۔

بداؤنی نے ایک لطیف نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جناب شیخ نے مجھ کو کلاہ مبارک عنایت کی اور حکم دیا کہ میری جانب سے اپنے گھر میں نیابت کرو۔ میرا طریق یہی

---

[1] یعنی حسین خاں ٹکریہ) اس کے لیے دیکھیے ترجمہ آئین اکبری از بلاخمن ۱: ۳۷۲، بداؤنی نے اپنی ملازمت کا ذکر منتخب ۲: ۱۳۶ پر بھی کیا ہے۔

[2] از مرزایان الغ بیگی۔

[3] پریچنگ آف اسلام کے مصنف آرنلڈ کی نظر سے منتخب التواریخ کا یہ مقام نہیں گزرا۔

Marfat.com

ہے۔آپ کے اہل خانہ نے بداؤنی کے متعلقوں اور فرزندوں کے لیے اوڑھنی اور رومال بھیجا۔ قوم کی اصلاح کا آغاز افراد اور ان کے گھرانوں کی اصلاح سے ہوتا ہے فرداً گر اپنے گھر میں اپنے شیخ کا نائب ہو کر اصلاح کو جاری کرے تو اس سے بہتر تدبیر اصلاحِ قوم کی تصور میں بھی نہیں آسکتی۔

بداؤنی نے واپسی کی اجازت چاہی تو عرض کیا کہ مشائخ ہند میں مشہور ہے کہ ایک سید کے خروج کا وقت نزدیک ہے۔ان میں سے اکثر کو ایک سید پر اتفاق ہے جس کے آبا و اجداد دہلی اور بداؤں کے تخت پر متمکن رہ چکے ہیں۔ وہ جہاد کا سامان اور اسلحہ کے بہم پہنچانے میں مصروف ہیں اور کہتے ہیں کہ اس بارے میں حضرت غوث اعظمؒ نے ہم کو حکم دیا ہے اور بعض امرائے سرحد بھی ان کے ساتھ مل گئے ہیں اور بعض کو مقامات اور واقعات میں بشارت بھی ملی ہے اب وہ چاہتے ہیں کہ اس ارادے کو عمل میں لائیں۔

شیخ داودؒ نے سید مذکور کی وضع اور حالت دریافت فرمائی۔ بداؤنی نے کہا کہ وہ گوشہ نشین فقیر ہے، پابند شریعت، منقطع، متوکل اور ریاضت کیش۔وہ اکثر دن کے وقت مقابر میں رہتا ہے اور رات کو اپنے حجرے میں مشغول عبادت و طاعت لیکن قبیلہ دار ہے اور سپاہی گری کے فنون میں یکتا۔اس کے علاوہ وہ خوش خلق اور صاحب اطوار شائستہ بھی ہے۔

شیخ نے یہ سن کر فرمایا یہ جماعت نادرویش ہیں جو حضرت غوث اعظم پر بہتان باندھ رہے ہیں۔ اور اس سید بے چارے کی راہ مار رہے ہے۔ وہ بشارات و اشارات سب شیطانی فریب ہیں حضرت غوث اعظم کی تعلیم تو یہ ہے کہ دنیا کی محبت دل سے نکال دی جاتے اور صدق و اخلاص سے محبت الٰہی کی طرف رجوع کریں اور آرزو اور ہوا و ہوس کے گرد نہ گھومیں۔حضرت یہ کب چاہتے ہیں کہ کوئی شخص ریاضت و مجاہدہ کو چھوڑ کر

Marfat.com

پھر دنیا کے جال میں پھنسے۔ میرا پیغام اس سیّد کو پہنچاؤ کہ خدا تم کو اس وادی میں جس میں تم ہو توفیق و استقامت بخشے! اگر دنیا کی محبت کا شائبہ بھی ابھی دل میں ہے تو اسے نکالنے کی کوشش کرو۔ نہ یہ کہ اس جماعتِ نادان و مغرور کی تزویر و تلبیس میں پھنس کر گمراہی میں جا پڑو، اگر طالب دنیا کو پادشاہی مل جاتے اور طالبِ آخرت نعمت ہائے جاودانی پاتے اور (ان دونوں کے برعکس) طالب خدا اپنے مطلب کو بھی نہ پاتے اور حسرت، محرومی و نومیدی ہی میں مر جاتے تو طالبِ خدا کی نامرادی اور ناکامی پہلے دونوں کی کامیابی سے ہزار بار بہتر ہے۔

راقم حروف جناب شیخ کی فراست اور صحیح فہم اور ادراک درست سے جو اس قصے سے ظاہر ہوتا ہے اپنے آپ کو سخت متأثر پاتا ہے۔ نیز اس سے کہ بداؤنی نے جب چاہا کہ دنیا کا کاروبار ترک کر کے خانقاہِ داؤدیہ کی جاروب کشی اختیار کرے تو آپ نے اجازت نہ دی اور فرمایا کہ: حالا بہندوستان باید رفت (منتخب ۲ : ۱۵۷)

میرزایان الغ بیگی کی شورش کی وجہ سے لاہور اور شیر گڑھ کے درمیان راستے خطرناک ہو گئے تھے۔ جناب شیخ نے بدرقہ بداؤنی کے ہمراہ کیا اور اس نے بداؤنی کو لاہور میں شیخ ابو اسحاق حزنگ کے پاس پہنچا دیا جو طلنبہ سے واپس ہو کر لاہور میں مقیم تھا۔

بداؤنی نے جناب شیخ کی تاریخ وفات ۹۸۲ھ ہجری دی ہے (منتخب التواریخ ۲ : ۱۹۸ اور ۳ : ۲۸) بداؤنی نے ہی (منتخب ۳ : ۳۳) میں لکھا ہے کہ "بعضی ازاں کلمات میمنت سمات کہ بر زبان الہام بیان و حقائق ترجمان می گزشت اینست:

Marfat.com

بسم اللہ الدلیل الہادی من ظلمات البحار البوادی . . . . ودیگر شعرہ :

سبحان من فی ذاتہ افکارنا تتحیر

سبحان من فی درکہ ابصارنا تنظیر[1]

وامثال ایں ادعیہ وتسبیحات واذکار وفقرات بسیار است "

کمالات قادریہ عرف مقامات معالیہ (طبع لاہور صفحہ ۱۰۱) پر اسی قسم کے کچھ اور کلمات دیے ہیں جو شیخ داؤد کی طرف منسوب ہیں۔ گمان یہ ہوتا ہے کہ جو کلمات مقبرے کی بیرونی دیوار پر درج ہیں اور ۶۲ صفحے پر نقل کیے گئے ہیں وہ جناب شیخ داؤد کی اپنی ہی عبارتیں ہیں واللہ اعلم

شیخ ابوالمعالیؒ

اُوپر ذکر ہوا تھا کہ شاہ ابوالمعالی جناب شیخ ابوداؤد کے بھتیجے تھے۔ جب شیخ نے (۹۸۲) میں وفات پائی تو یہ شیرگڑھ میں ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ اخبار الاخیار (جو اس کتاب کے قطعۂ تاریخ کی رُو سے ۹۹۹ھ میں تصنیف ہوئی) میں ہے کہ اب شیخ داؤد کے جانشین شیخ ابوالمعالی ہیں۔ ان کی نسبتیں اونچی اور قدریں بلند ہیں۔ ریاضت کیش اور مجاہدہ کش ہیں۔ مقبول ہیں صحت حال کے علاوہ حسن مقال سے بھی متصف ہیں۔ مناقب حضرت غوث الثقلین کو فارسی[2] کا لباس پہنایا ہے، نہایت لطیف، فصیح اور شیریں۔

[1] ایک قلمی نسخے میں تطمیر

[2] اس رسالے کا نام تحفۂ قادریہ ہے اس کا اردو ترجمہ لاہور میں ۱۳۲۳ء میں طبع ہوا۔ یہ ۱۰۸ صفحے کا

(باقی اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

Marfat.com

شبیہ مبارک حضرت شاہ ابوالمعالیؒ

غربتی بانگِ اناالحق زن واز دار مترس
زانکہ معراج درین رہ رسن و دار بود

یارب نظری زعینِ مقصودم بخش * آزادگی زِ بُود و نابُودم بخش
ہرچند نیم درخورِ این دولتِ خاص یک ذرّہ زِعشقِ شیخِ داؤدم بخش

Marfat.com

بسم اللہ الدلیل ا

Marfat.com

اس وقت تک شیخ عبدالحق مصنف اخبار الاخیار کی ملاقات شیخ ابوالمعالی سے نہ ہوئی تھی۔ لکھتے ہیں کہ اشتیاق ملازمت او بسیار است انشاءاللہ میسر گردد[1]۔ تحفۃ المعالیہ (طبع لاہور ۱۳۲۴) صفحہ ۴ بعد پر ان کا حال دیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ۹۸۲ھ میں جب حضرت شیخ المشائخ داؤد کرمانیؒ نے انتقال فرمایا تو شاہ ابوالمعالی کی عمر اس وقت ۲۲ سال کی تھی۔ وہ شیر گڑھ میں مسند داؤدیہ پر قائم مقام اور سجادہ نشین ہوئے اور ۲۹ سال تک وہاں رہے۔ پیر کے روضۂ منورہ کو آپ ہی نے تعمیر کرایا یہ تعمیر ۹۹۷ھ میں ختم ہوئی۔ آخر اپنے شیخ کے روحانی ارشاد کے مطابق لوازم مشیخیت آپ نے شیخ عبداللہ بن شیخ داؤد کے سپرد کیے۔ منتخب التواریخ (۲ : ۳۸۹) میں شیخ عبداللہ کی تاریخ وفات ۱۰۰۲ھ دی ہے بالآخر جناب ابوالمعالی ۱۰۱۱ میں ۵۱ سال کی عمر میں لاہور کو روانہ ہوئے۔ راستے میں کئی جگہ وہ چلہ کشی میں مصروف رہے تا آنکہ لاہور پہنچے اور وہاں مقیم ہوئے اور ۶۳ سال کی عمر پاکر ۱۰۲۴ بعہد جہانگیر بادشاہ فوت ہوئے آپ کا روضۂ مبارک لاہور میں ہے۔

جناب ابوالمعالیؒ صاحب دیوان شاعر ہیں۔ انکا تخلص غربتی، مسلمی اور بعض اشعار

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) مختصر سا رسالہ ہے تحفۃ القادریہ از ابوالمعالی محمد مسلمی کا قلمی نسخہ انڈیا آفس میں ہے دیکھیں فہرست ایتے (Ethe) عدد ۱۸۰۳

[1] یہ ملاقات ہوئی کتاب المکاتیب و رسائل و برہامش اخبار الاخیار (دہلی ۱۳۳۲ھ) صفحہ ۳۸۱ بعد پر ملاقات کی تفصیل شیخ عبدالحقؒ نے اپنے لڑکے شیخ نورالحق کو ایک خط میں لکھی ہے اس وقت شرح مشکوٰۃ ابھی تمام نہیں ہوئی تھی۔ ۱۰۱۹ھ میں شیخ نے عربی اور فارسی میں شرح مشکوٰۃ لکھنی شروع کی تھی ۱۰۲۵ھ میں عربی شرح ختم ہوئی اور فارسی شرح کا نصف حصہ مکمل ہوا بقیہ نصف فارسی ۱۰۲۹ھ میں تمام ہوا اس لیے بظاہر یہ ملاقات ۱۰۲۵ اور ۱۰۲۹ کے درمیان ہوئی

Marfat.com

میں معالی ہے۔ روضۂ مبارک جناب داؤدؒ کی دیواروں پر جو اشعار درج ہیں وہ آپ ہی کے ہیں۔ ان میں آپ نے مسلمی اور معالی تخلص کیا ہے۔ تحفۃ المعالیہ میں دیوان اور تحفۂ قادریہ کے علاوہ آپ کی تصانیف میں رسائل ذیل کو بھی شامل کیا ہے رسالۂ گلدستۂ باغ ارم، گلدستۂ زعفران زار، رسالۂ مونس جان (اس آخری رسالہ کا کچھ مضمون تحفۃ المعالیہ صفحہ ۶۷ پر نقل ہوا ہے) زعفران زار کا اردو ترجمہ تاجران کتب قومی نے لاہور سے شائع کیا۔ اس میں چار چمن ہیں، دیکھیے ہشت بہشت طبع اول صفحہ ۴۷۵)۔

کتاب المکاتیب والرسائل میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے دو مکتوب ان کے نام ہیں (دیکھیے ۳۳۹ و ۳۷۴) اور ایک مکتوب میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے ان سے ملاقات کا حال بیان کیا ہے جس میں شیخ موصوف نے آپ کی شخصیت پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

حاصل یہ کہ شیر گڑھ والا روضہ شیخ الشیوخ حضرت داؤد کرمانی کا روضہ ہے ان کا حال اختصار کے ساتھ اوپر درج ہوا۔ روضے کی اندرونی دیواروں پر جو فارسی نظم درج ہے وہ شیخ الشیوخ کے بھتیجے شیخ ابوالمعالیؒ کی تصنیف ہے۔ منتخب التواریخ ۲ : ۱۵۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ بدایونی جب شیخ داؤد کی خدمت میں حاضر ہوا تو ذیل کے چند بیت اس نے بدیہۃً کہہ کر پیش کیے اور وہ درجۂ قبول تک پہنچے۔

ای منزہ نسبت ایجاد تو از ماء و طین

ذات پاکت چون پیمبر رحمۃ للعالمین

لے دیوان کے متعلق معلوم نہیں کہ اس کا کوئی نسخہ روضۂ جناب ابوالمعالیؒ کے متولیوں کے پاس موجود ہے! نہیں مگر آپ کے متعدد اشعار تحفۃ المعالیہ میں درج ہوئے اور چند شعر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے ایک مکتوب میں دیے ہیں ملاحظہ ہو کتاب المکاتیب والرسائل صفحہ ۳۸۲ ببعد

Marfat.com

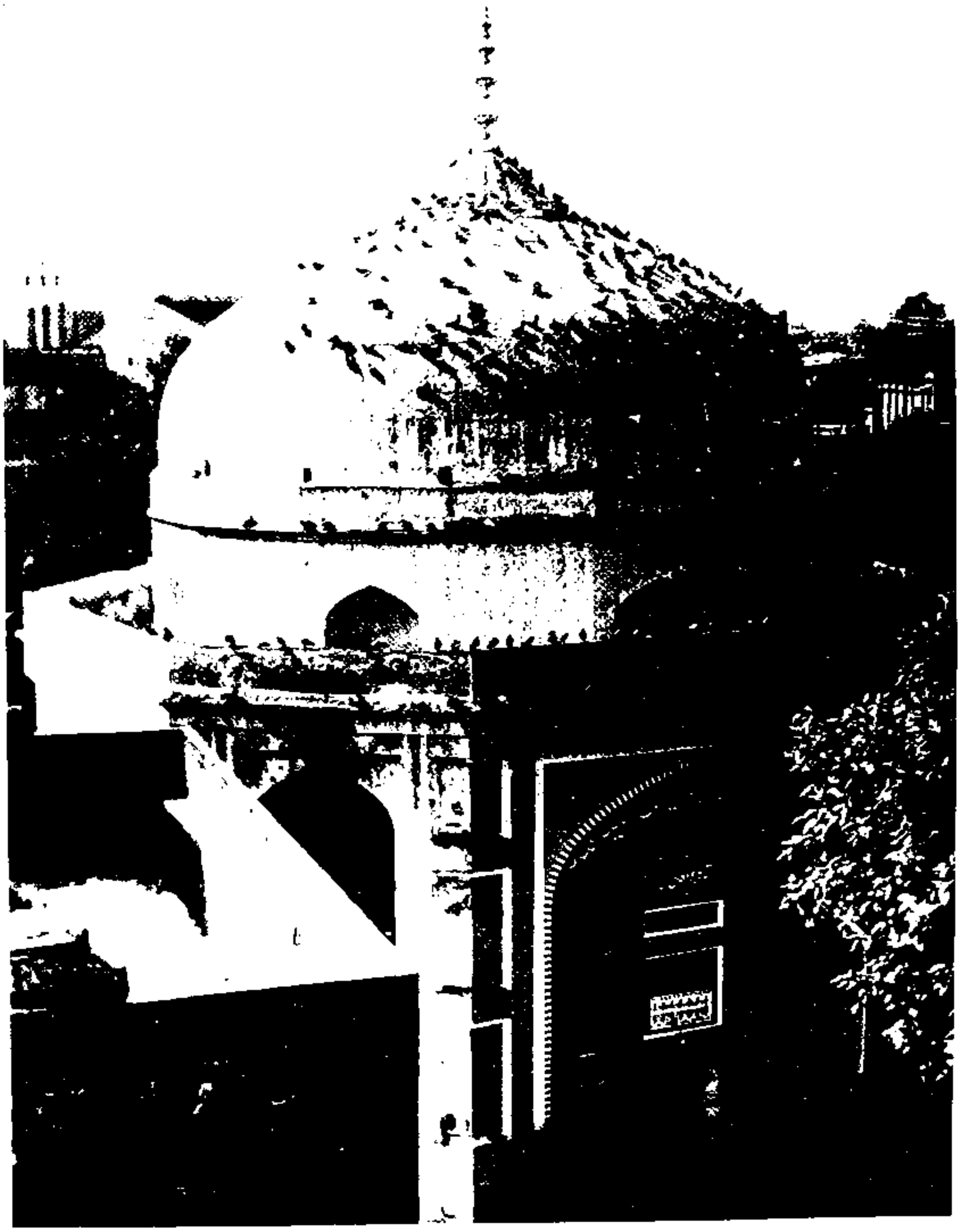

روضہ حضرت شاہ ابوالمعالیؒ جسے اُن کے فرزند سیّد محمّد باقر نے تعمیر کروایا۔
بعد میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سپہ سالار میاں غوثہؒ نے تعمیر میں توسیع کی
دیکھئے "رنجیت سنگھ" مہاراجہ آف پنجاب مصنّفہ خوشونت سنگھ صہ ۱۲۷

Marfat.com

بیں معالی

ہی کہ

Marfat.com

ہست اسم اعظمت داؤد از تاثیر آں
چوں سلیمان جن وانس آمد ترا زیر نگیں
ثم وجہ اللہ یقین من نمی شد سالہا
روی تو دیدم عیاں شد نکتۂ عین الیقین

گمان ہوتا ہے کہ شیخ ابوالمعالی نے انھیں اشعار سے متاثر ہو کر اور ان کی تقلید میں اسی بحر اور قافیہ و ردیف میں نظم مذکور مرتب کی۔ واللہ اعلم۔

محمد شفیع

راقم الحروف سید محمد حیدر شیر گڑھی کا مرہون منت ہے کہ انھوں نے تحفۂ قادریہ، مقامات معالیہ، تحفۃ المعالیہ اور حدیقۃ اولیا اور تذکرہ مولانا ابوالکلام مطالعہ کے لیے عنایت کیے انھوں نے ازراہ کرم ایک تحریر کا فوٹو بھی دکھایا جو دربار داؤدیہ سے ایک مرید کے نام جاری ہوئی۔

Marfat.com

انھوں نے اپنے وصال سے چند سال پہلے ایک دن اپنے صداقت عار اصحاب سے فرمایا کہ میرے مرقد کا مقام یہی نور محل ہے۔ نور محل (آپ کا) روضہ منوّرہ بننے سے پہلے ایک گھر (کمرہ) تھا جو باغیچے کے وسط میں کچی اینٹ سے تعمیر ہوا ہوا تھا۔ اس گفتگو کے دوران میں آپ کے اصحاب میں سے کسی نے عرض کیا کہ آپ ابھی حکم دیجیے تاکہ آپ کے سامنے ہی آپ کی شایانِ شان اور موافق آداب یہ روضہ تعمیر ہو جائے۔ فرمایا ہاں، مگر اس مقبرے کا معمار تو ابھی اپنے ساتھی بچوں کے ساتھ کھیلتا پھرتا ہے وہ میری وفات کے بعد آئے گا اور اس کی عمارت بنائے گا۔

روضۂ منوّرہ کی تعمیر کا بیان

استاد بازید، وہ بدائع بین، صورتوں کا نقش گر، وہ مشکلاتِ مانی کا حل کرنے والا، اور وہ کارخانۂ صنعتِ الٰہی کا انجینئر جو بانی کعبۂ ثانی کے خطاب سے مخاطب ہوا اور جو حکمتِ تعمیر کے فن میں بے نظیر اور زہد و عبادت میں یکتا تھا، بتایا کرتا کہ میرا والد معمولی گارا مٹی لگانے والا معمار تھا وہ (کاریگروں کی) کسی شمار قطار میں نہ آتا تھا وہ صرف کچّی عمارتیں کھڑی کیا کرتا تھا اور نقش گری کا کام نہ جانتا تھا میرے بچپن میں وہ مجھے میرا ہاتھ پکڑے لے جاتا اور اونچی عمارتوں اور عالی شان تعمیرات

Marfat.com

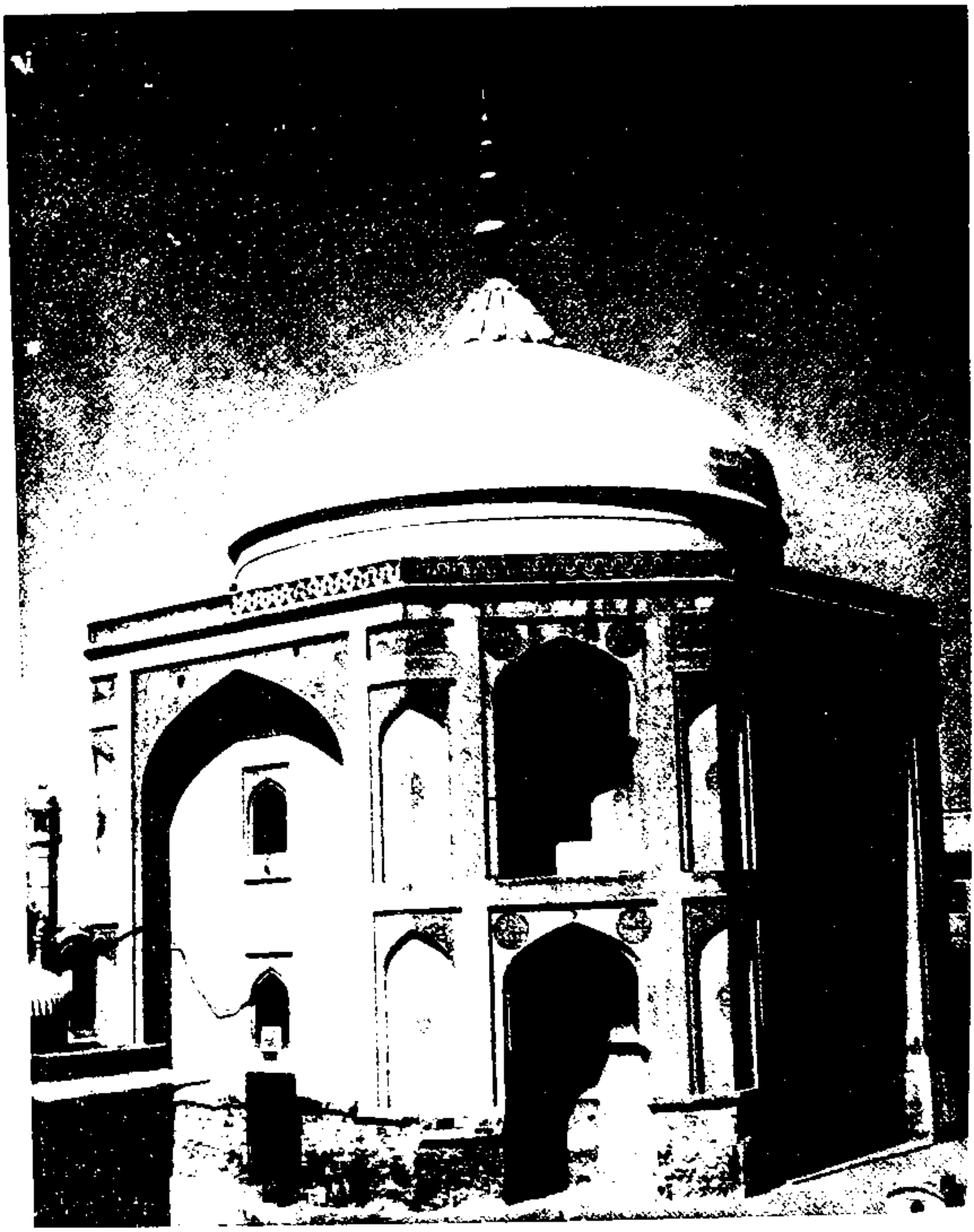

روضہ حضرت شیخ داؤد جھنی وال۔ شیر گڑھ ضلع ساہیوال (دیکھئے ضمیمہ ۲ صفحہ ۱۰۴)

Marfat.com

Marfat.com

مجھے دکھاتا میرا شعور روز بروز از حد ترقّی پذیر رہا اور میرے فہم کا دریچہ عام قاعدۂ قدرت کی بہ نسبت زیادہ کھلتا گیا۔ میں ابھی بے ریش و بروت تھا کہ میری خاکہ کشی اور صنعت گری اس فن کے کہنہ مشق حضرات کو بھی سبق سکھانے لگی۔ حضرتِ والا کے وصال کے چند ماہ بعد ازلی خوش بختی کی کشش نے میری تمنّا کا گریبان کھینچا اور میں اپنے چند ہم پیشہ ہمزادوں کے ساتھ مرقدِ منوّر کی زیارت کے لیے شیر گڑھ جا پہنچا۔

میں نے دیکھا کہ اینٹوں کے چَٹّے ڈھیر ہو رہے ہیں۔ چنانچہ مَیں نے لنگر کے متولّی شیخ مُوسیٰ سے التجا کی کہ جو کچھ تعمیر کرنا مقصود ہے اس کی اجازت بخشی جائے۔ انھوں نے جواب دیا ہمیں تو یہ چاہیے کہ کوئی سالخوردہ صاحب فن خاکہ بنائے (ماڈل تیار کرے) پھر اینٹ لگائے۔ یہ جواب سن کر ہم رنجیدہ خاطر ہوئے اور لاہور واپس آگئے۔ میری واپسی کے بعد متولّی نے خواب میں حضرتِ والا کی زیارت کا شرف حاصل کیا حضرتِ والا نے ارشاد فرمایا کہ اس تعمیر کا کام اسی نوجوان کو سونپ دو جو یہاں سے منہ موڑ کر چلا گیا ہے۔ چنانچہ متولّی صاحب نے میرے تعاقب میں دو خادم دوڑائے۔ بہرحال مجھے لاہور سے بلا کر (حضرت والا کے) حسب الحکم کام میرے سپرد کر دیا۔ جب تعمیر کا کام شروع ہوا تو ماہرین ہر جانب سے آ کے اکٹھے ہو گئے۔ مَیں نو آموز تھا بہت متردّد ہوا اور سوچ میں ڈوب گیا کہ خاکہ کس طرح کا ظہور میں آئے۔ رات رات بھر کاغذ پر قلم چلاتا رہا۔ لیکن آخر تعمیر کا آغاز کرا دیا۔ ہر اینٹ پر جو ہم نے لگائی اس کے لگانے سے قبل مَیں درود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حضور نذر کرتا۔ صلحا، فقرا اور اہلِ ارادت اینٹ اور گارا ہاتھ میں تھماتے وقت دو بار سورۂ اخلاص پڑھتے۔ لوگ اتنے زیادہ تھے اور بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ اینٹ دینے کی باری دیر سے اور مشکل سے آتی تھی اس انداز سے ساڑھے چار سال کی

Marfat.com